عہدِ نبوی کے غزوات و سرایا اور
اور اُن کے ماخذ پر ایک نظر

مولانا سعید احمد اکبرآبادی
صدر شعبہ سُنّی دینیات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

۱۹۶۷ء

عہدِ نبوی کے
غزوات و سرایا اور اُن کے ماٰخذ پر ایک نظر

سعید احمد اکبر آبادی

(۱)

اگرچہ مقالہ کا موضوع بحث غزوات و سرایا ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری پیغمبرانہ زندگی شروع سے آخر تک اس طرح مربوط و مسلسل ہے کہ اس کے کسی جزو کو دوسرے اجزاء سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اور اگر کسی نے ایسا کیا تو وہ صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، اس کی نوعیت، مکہ کی زندگی اور پھر ہجرت کا تذکرہ مختصراً کر دیا جائے۔

یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ مغربی مصنفین[۱] جنھوں نے اسلام اور سیرت

---

[۱] ان میں وہ مشنری شامل نہیں ہیں جنھوں نے اسلام یا حضور کی سیرت پر کتابیں لکھی ہی ہیں اسلام کے خلاف سخت معاندانہ پروپیگنڈہ کرنے کی غرض سے اور اس لئے واقعات کو توڑ موڑ کر اور اصل حقائق کو مسخ کر کے انھوں نے اپنی خباثتِ نفسی اور دنائتِ طبع کا سخت المناک مظاہرہ کیا ہے، ان لوگوں کی پروفیسر گب، پروفیسر آربری اور ہمارے زمانے کے فاضل مستشرق پروفیسر منٹگمری نے بھی سخت مذمت کی ہے۔

مقدسہ پر علمی اور تحقیقی انداز پر کتابیں لکھی ہیں۔ اور لب و لہجہ سنجیدہ اور متین رکھا ہے چونکہ ان کا ذہن نبوت اور رسالت کے تصور سے خالی ہے۔ اس بنار پر انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا جائزہ ایک عظیم انسان، ایک عظیم مفکر اور ایک عظیم رہنما اور مقنن کی حیثیت سے لیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غزوات و سرایا کا رشتہ بھی حضور کی اس حیثیت کے ساتھ جوڑ کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے۔ کہ آپ نہایت بلند حوصلہ اور صاحب عزم انسان تھے۔ فاتح اور سیاست کے ماہر تھے۔ جنگ کے طریقوں سے خوب واقف تھے یہ سب چیزیں اپنی جگہ کیسی ہی درست ہوں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ حیثیت کو نظر انداز کر جانے کے باعث یہ حضرات ان غزوات و سرایا کے ان پہلوؤں اور سیرتِ نبوی کے ان گوشوں سے قصداً یا بلا قصد کے اغماض کر جاتے ہیں۔ جن سے ان غزوات کی اصل حیثیت و نوعیت متعین ہوتی ہے۔ اور جو ایک پیغمبر اور فاتح و کشور کشا کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتے ہیں۔ غور کیجئے کہ بدر کا معرکہ کارزار بپا ہے۔ ایک طرف عرب کے بہترین جنگ آزماؤں کی فوج گران نوسو کی تعداد میں ساز و سامان سے آراستہ اور مکمل طور پر ہتھیار بند ہے اور دوسری طرف صرف تین سو تیرہ انسانوں کا ایک دستہ ہے۔ جس کے پاس نہ پورے ہتھیار ہیں اور نہ ضروری ساز و سامان۔ جنگ اپنے شباب پر ہے دونوں طرف سے تلواریں چل رہی ہیں اور نیزے لپک رہے ہیں۔ لاشیں تڑپ تڑپ کر گر رہی ہیں۔ زخمی بدن سے خون کے فوارے ابل رہے ہیں۔ لیکن اسی عالم کرب و اضطراب میں اسی بے سرو سامان فوج کا قائدِ اعظم بارگاہِ خداوندی میں خشوع و خضوع کا پیکرِ مجسم بنا سربسجود ہے اور اپنے مالک و آقا سے کہہ رہا ہے: اے خدا! اگر آج یہ چند نفوس مٹ گئے تو پھر قیامت تک تیری بندگی کرنیوالا کوئی نہ ہوگا۔ اسی عالم میں وہ آسمان کی طرف دیکھتا اور ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے: اے خدا! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اُسے آج پورا کر۔ کوئی بتائے کہ

امید و بیم کے اس نازک ترین موقع پر یہ کیرکٹر بجز ایک پیغمبر برحق کے اور کس کا ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اسی غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہؓ اور حضرت ابوحسیلؓ دو صحابی کہیں سے آرہے تھے کہ راستہ میں قریش نے روکا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کو جا رہے ہو۔ انھوں نے انکار کیا اور عدم شرکت کا وعدہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر پورا واقعہ سنایا اور جنگ میں شرکت کی اجازت طلب کی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم ہر حالت میں وعدہ پورا کریں گے اور ہمیں صرف خدا کی مدد درکار ہے[1]۔ سوچنا چاہئے کہ سخت بے سروسامانی اور قلتِ تعداد کے باوجود اعلیٰ اخلاق کی یہ پاسداری اور خدا کی مدد پر یہ بھروسہ اور یقین کیا دنیا کے کسی بڑے سے بڑے فاتح میں بھی پائے جاتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

بہرحال غزوات و سرایا کے یہی اسرار و رموزِ باطنی اور روحانی ہیں جو مغربی مصنفین اور ان کے متبعین سے ان کے علم و تحقیق کے باوجود مخفی رہ جاتے ہیں۔ اور اس بنا پر اس کوتاہ نظری پر غزوات و سرایا سے متعلق تحقیق و تفتیش کی جو عمارت قائم ہوتی ہے وہ غزوات کی صحیح عکاسی کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ غزوات پر گفتگو کرنے سے پہلے صاحبِ غزوات (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت و رسالت اور غزوات کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے تک کے حالات کا مختصر جائزہ لے لیا جائے۔

نبوت کسبی اور اختیاری منصب نہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعاتِ زندگی اور سیرت کے لئے قرآنِ مجید سے بڑھ کر مستند اور اعلیٰ واشرف مآخذ اور کیا ہو سکتا ہے! نبوت سے پہلے کے آپ کے واقعات

---

[1] صحیح مسلم بحوالہ سیرت النبی جلد اول ص ۲۹۷۔

حالات جو قرآن مجید میں مذکور ہیں ان سے چند مگر نہایت اہم یہ باتیں ۔

(۱) ۔ آپ یتیم پیدا ہوئے تھے [1]

(۲) ۔ آپ کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی ۔ حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد یہ حالت بہتر ہو گئی تھی [2] ۔

(۳) ۔ آپ امی تھے ۔ نہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور نہ یہ جانتے تھے کہ دین اور ایمان کیا چیز ہے ۔

(۴) ۔ آپ تلاشِ حق میں سرگرداں اور حیران و پریشاں تھے تو اللہ نے آپ کو ہدایت دکھایا یعنی پیغمبری عطا فرمادی [3] ۔

ان آیات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ رسالت و نبوت کا کوئی تصور تھا نہ یہ آپ کا معاذاللہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ اور پروگرام تھا ۔ نہ آپ اس منصب کے لئے تیاریاں کر رہے تھے ۔ بلکہ یہ منصب اچانک اور آپ کی کسی توقع ، امید یا انتظار کے بغیر آپ کو سپرد کیا گیا ۔ چنانچہ صحیح بخاری کے شروع میں ہی باب بدء الوحی کے زیرِ عنوان جو طویل روایت مذکور ہے اس کا مضمون بھی یہی ہے کہ غارِ حرا میں آپ کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا تھا آپ خود اس کی کوئی توجیہ نہیں کر سکے تھے ۔ اور ایک غیر معمولی صورتِ حال کے پیش آجانے کے باعث آپ پر لرزہ طاری ہو گیا تھا ۔ لیکن حضرت خدیجہؓ کی فراست اور اعلیٰ اقدارِ حیات پر جزم و یقین نے اس کی ایک جھلک دیکھ لی اور ورقہ ابن نوفل سے گفتگو کے بعد اس کی تصدیق ہو گئی ہے ۔

نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک ایک

---

[1] ۔ سورۃ والضحیٰ ۔ [2] ایضاً [3] ۔ ایضاً

قول اور عمل کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے مسئول اور جواب دہ تھے۔ اور اب آپ کا جو قدم اٹھتا تھا اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اور اس کی نگرانی میں اٹھتا تھا۔
اپنی رسالت کا اعلان فرمایا تو شروع میں (کم و بیش ایک برس کے اندر) بادن حضرات مسلمان ہوئے لیکن ان میں سے اکثر کی عمر اس وقت بیس برس سے کم تھی اور ان کے خاندان کے بڑے بوڑھے سب کفر و شرک پر قائم تھے۔ نوجوانوں کے علاوہ کچھ غریب غربار تھے۔ اور کچھ غلام تھے۔ توحید کی دعوت نے مکہ کے لوگوں میں آگ تو لگا ہی دی تھی۔ یہ مسلمانوں کی سب سے پہلی جماعت ان کے غیظ و غضب کا نشانہ بن گئی۔ جو غریب غربار یا باندی غلام تھے ان کا کوئی سہارا یا مددگار نہیں تھا۔ اس لئے ظلم و ستم اور جبر و تعدی کا منہ سب سے زیادہ انہیں کو دیکھنا پڑتا تھا۔ اس بنا پر دعوت اسلام شروع میں عام اور برملا نہیں بلکہ پوشیدہ تھی اسلام قبول کرنے والوں میں ارقم بن الارقم بارہویں نمبر پر تھے۔ ان کا مکان صفا کے دامن میں تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہ سب حضرات انھیں کے گھر میں جمع ہوتے اور باہم مشورہ اور مذاکرہ کرتے تھے۔ یہ دعوتِ اسلام کا بالکل ابتدائی دور ہے۔ اس کی مدت تین برس ہے۔

دعوتِ اسلام کا دوسرا دور

اس حالت پر کم و بیش تین برس گذرے تھے کہ اب دعوت کے عام اور علانیہ کر دینے کا فرمانِ الٰہی صادر ہوا۔ ارشاد ہوا۔

فاصدع بما تؤمر و اعرض عن المشرکین — آپ کو اب جو جو احکام ملتے رہیں انھیں کھل کر بیان کیجئے اور مشرکین کی پرواہ نہ کیجئے اور
و انذر عشیرتک الاقربین — اپنے قریبی رشتہ داروں کو خدا کا خوف دلائیے

اس حکم کی تعمیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت و تبلیغ عام اور برملا

کر دی اور اس کا آغاز اس طرح کیا کہ مکہ کی آبادی کے باہر سب اہلِ قریش کو ایک جگہ جمع کیا۔ اور ان کے سامنے پوری صفائی اور وضاحت کے ساتھ توحید اور بت پرستی کی مذمت بیان فرمادی۔ اسی طرح رشتہ داروں کو جمع فرمایا اور ان کو ایمان و عملِ صالح کی دعوت دی۔ اس دعوتِ عام و برملا کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے دلوں میں اندر ہی اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور دشمنی کی جو آگ سلگ رہی تھی۔ اب وہ کوہِ آتش فشاں بن کر یک بیک پھٹ پڑی۔ اسلام کی تاریخ کا پہلا دن تھا جب کہ دینِ قیم کے مقابلہ پر باطل نے اپنی جمعیت کی صف آرائی کا اعلان کر دیا۔ اور ہمیں کہنا چاہیئے کہ اب سے دس برس کے بعد جن غزوات کا سلسلہ شروع ہوا ان کا طبلِ جنگ درحقیقت اسی وقت بج گیا تھا

ایک اہم نکتہ اس موقعہ پر خاص طور سے یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اگر عام حالات ہوتے تو اسباب ظاہری کے پیشِ نظر قریش کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں سے عہدہ برآ ہونا چنداں مشکل نہیں تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب کے لوگ اس زمانے میں قبائلی زندگی کے جن آداب و ضوابط میں جکڑے ہوئے تھے ان کی وجہ سے قریش کے لئے من مانی کرنا آسان نہیں تھا۔ ابوطالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم اور حضرت خدیجہؓ آپ کی زوجۂ محترمہ تھیں اور یہ دونوں قریش کی برادری کے نہایت اہم اور معزز رکن تھے۔ اس لئے جب تک حضور کو ان دونوں کی حمایت اور حفاظت حاصل تھی یہ لوگ حضور کو قتل نہیں کر سکتے تھے۔ اس بنا پر اب قریش نے باہم مشورہ کے لئے متعدد اجتماعات منعقد کئے اور ہر مرتبہ کوشش کی کہ ابوطالب حضورؐ کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں مگر ایسا نہ ہوا تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو ستانے کے لئے طرح طرح کے طریقے اختیار کئے۔ آپ کو ساحر اور کاہن مشہور کیا۔ اپنے

اور دوسرے قبیلوں کے لوگوں کو آپ کے پاس جانے سے روکا آپ کے غریب ترین ساتھیوں کو سخت ترین جسمانی اذیتیں پہنچائیں ۔ چچا ابو طالب نے جب یہ دیکھا تو اپنی قوم کو حضور کی حمایت کی دعوت دی بنی عبدالمطلب ، بنی ہاشم ، اور بنی عبد مناف ان سب نے ابولہب کو مستثنیٰ کرکے اس دعوت کو قبول کیا ۔

ہجرت حبشہ

اِن قبائل کی حمایت کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جانی تحفظ تو سردست ہوگیا لیکن اور اذیتوں میں کمی نہیں ہوئی اور ادھر صحابۂ کرام کے لئے روز بروز زندگی دشوار ہوتی جارہی تھی ۔ اس لئے آپ نے اِن حضرات کو حبشہ کی ہجرت کا مشورہ دیا یہ ہجرت دو مرتبہ ہوئی ہے ۔ اولاً بارہ مرد اور چار عورتیں نبوت کے پانچویں برس ماہ رجب میں حبشہ گئے ۔ انھوں نے وہاں دو مہینے قیام کیا تھا کہ انھیں معلوم ہوا کہ اسلام مکہ میں پھیلنے لگا ہے ۔ یہ سن کر مہاجرین واپس آگئے ۔ لیکن مکہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی اور قریش اسلام کی عداوت اور دشمنی میں پہلے سے بھی زیادہ سخت ہوگئے ہیں ۔ اس لئے تھوڑے دنوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دوبارہ حبشہ جانے کا مشورہ دیا ۔ چنانچہ پہلے حضرت جعفر ابن ابی طالب اور پھر دوسرے مسلمان یکے بعد دیگرے روانہ ہوئے ۔ بعض حضرات اپنے متعلقین کے ساتھ تھے ۔ اور بعض تنہا ۔ اب جو مسلمان وہاں پناہ گزین تھے ، عام اور مشہور روایت کے مطابق ان کی تعداد تراسی یا چوراسی بیان کی جاتی ہے ۔

قریش نے مہاجرین کا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا ۔ دو آدمیوں کا وفد بھیج کر کوشش کی کہ شاہِ حبشہ مہاجرین کو اپنے ملک سے نکال دے ۔ لیکن اس مشن میں ان کو ناکامیابی ہوئی اور شاہ نے مہاجرین کے نمائندہ حضرات سے گفتگو کے بعد ان مسلمانوں کو مکہ واپس کرنے سے انکار کردیا

شعب ابی طالب

اس مایوسی اور ناکامی نے قریش کی جلتی پر تیل کا کام کیا ادر ادھر حضرت عمرؓ مسلمان ہو چکے تھے جس کے باعث مسلمانوں کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اور وہ علانیہ عبادت کرنے لگے تھے۔ اس صورتِ حال پر قریش قابو سے باہر ہو گئے۔ اور اب ان لوگوں نے ایک تحریری معاہدہ کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثاروں کا سوشل بائیکاٹ کرنے کا اعلان کر دیا عہدنامہ جو خانہ کعبہ پر آویزاں کیا گیا تھا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ بنو ہاشم اور بنو المطلب کی لڑکیوں کے ساتھ نہ کوئی عقد کرے گا اور نہ ان کو اپنی لڑکی دیگا۔ ان سے نہ کوئی چیز خریدی جائے گی۔ اور نہ کوئی چیز ان کے ہاتھ فروخت ہوگی۔ جناب ابوطالب کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ مذکورہ بالا دونوں خاندانوں کے لوگوں کو مع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لے کر شعب ابی طالب میں چلے گئے جو مکّہ کے پہاڑوں میں ایک درّہ اور بنو ہاشم کا موروثی ملک تھا۔ یہ واقعہ نبوت کے ساتویں برس ماہ محرم کا ہے۔

اس موقعہ پر دو باتیں خاص طور پر یاد رکھنے کی ہیں جو عام سیرت نگاروں سے نظرانداز ہو گئی ہیں۔ (۱)۔ ایک یہ کہ قریش نے بنو ہاشم اور بنو المطلب کے مقاطعہ کا جو عہدنامہ لکھا تھا عام مورخین سیرت اور ارباب روایت کے مطابق اس کے الفاظ وہی ہیں جو ہم نے اوپر لکھے ہیں۔ البتہ مولانا شبلی نے (سیرت النبی ج ۱ ص (۲۴۵) ان الفاظ پر "جب تک وہ (بنو ہاشم) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کے لئے حوالہ نہ کریں گے"، کا اضافہ کیا ہے، لیکن اس اضافہ کی نسبت مولانا حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ یہ الفاظ صرف مواہب لدنیہ میں مذکور ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بعینہٖ یہی الفاظ حافظ ابن عبدالبر کی کتاب "الدرر فی اختصار المغازی والسیر" میں بھی موجود ہیں۔

لہ ص ۵۷، ۶۰ ۔ مولانا شبلی نے "صرف مواہب لدنیہ" اس لئے لکھا ہے

(باقی صفحہ ۳۷۵ پر)

علمار کا اتفاق ہے کہ سیرتِ مقدسہ میں سب سے زیادہ مستند اور معتمد علیہ وہ کتابیں ہیں جو محدثین نے لکھی ہیں اور حافظ ابن عبدالبر جس پایہ کے محدث ہیں ارباب نظر پر پوشیدہ نہیں۔ پھر مواہب لدنیہ کے مصنف علامہ قسطلانی کے بلند پایہ محدث ہونے میں بھی کلام نہیں۔ وہ صحیح بخاری کے مشہور شارح ہیں۔ ہم نے کتب سیرت کا استقصا نہیں کیا۔ ورنہ ممکن ہے کہ یہ الفاظ اور بعض کتابوں میں بھی موجود ہوں بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ اب اسلام کی ترقی اور اشاعت اور اپنی تمام کوششوں کی ناکامی ونامرادی نے قریش کو اس درجہ بوکھلا دیا تھا کہ وہ حضور کی جان کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اور اس کے علاوہ ان کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس کی تائید بعض اور روایات سے بھی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں بنو ہاشم اور بنی المطلب ان سب کا عام مقاطعہ اور جناب ابو طالب کا اس پر یہ اہتمام کہ سب کو لے کر شعب ابی طالب میں چلے گئے۔ یہ بھی اس بات کی صاف دلیل ہے کہ معاملہ انتہائی نازک اور سنگین تھا۔ یعنی یہ لوگ حضور کے قتل کے درپے تھے۔ اور اب اس سے کم کسی چیز پر وہ راضی نہیں ہو سکتے تھے۔

(۲)۔ دوسری اہم چیز جو اس واقعہ میں لحاظ کے قابل ہے یہ ہے کہ شعب ابی طالب میں جن لوگوں نے پناہ لی وہ دو ایک آدمیوں کو مستثنیٰ کر کے بنو ہاشم اور بنو المطلب کے سب لوگ تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ اور وہ بھی تھے جنھوں نے اب تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ پہلا طبقہ تو اپنے دین کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۴) کہ حافظ ابن عبدالبر کی کتاب اُن کے زمانہ میں طبع نہیں ہوئی تھی اور اُس کا مخطوطہ اُن کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ یہ کتاب ڈاکٹر شوقی ضیف کی تصحیح و تعلیق سے ابھی ۱۹۶۶ء میں قاہرہ میں طبع ہوئی ہے۔

لئے یہ سب آفات و شدائد برداشت کرنے کے لیے آمادہ ہوگیا تھا۔ لیکن دوسرے طبقے کے لئے باعث اور محرک کیا تھا جس کی وجہ سے وہ سب سختیاں انگیز کررہے تھے؟ عام خیال یہ ہے کہ اس کا سبب قبائلی حمیت تھا۔ ہمیں اس سے انکار نہیں لیکن ذرا گہرائی میں جائیے تو معلوم ہوگا کہ اس کا ایک بڑا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی جاذبیت اور کشش اور اس کے ساتھ ہی حضور کے کردار اور عمل اور آپ کی بے لوث و بےغرض زندگی کا اثر بھی تھا۔ اگرچہ اب تک ان لوگوں نے مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کیا تھا لیکن ان کے دل بے شبہ متاثر تھے۔ ابوطالب نے موت کے وقت جن احساسات کا اظہار کیا تھا۔ ہمارے نزدیک کم وبیش اس وقت یہی احساسات ان سب لوگوں کے تھے۔

شعب ابی طالب میں ان سب لوگوں کا قیام جن میں بچے بھی تھے اور عورتیں بھی تین برس کے قریب رہا۔ اس مدت میں وہ کونسی تکلیف تھی جو انھوں نے نہیں اٹھائی۔ اور وہ کونسی سختی اور اذیت تھی جو انھوں نے برداشت نہیں کی۔ لیکن کیا مجال کہ ان کے پائے صبرو استقلال میں کوئی لرزش پیدا ہوئی ہو۔ مظلومیت کا کمال یہ ہے کہ خود ظالم کو رحم آجائے آخر دشمنوں میں چند لوگوں نے عہدنامہ منسوخ کردینے کی تحریک کی۔ اور بڑی ردوکد او بحث وگفتگو کے بعد ایک شخص مطعم بن عدی نے سبقت کی اور عہدنامہ کو چاک کردیا۔ پھر ایک روایت کے مطابق یہی مطعم چند اور سرداران قریش کے ساتھ ہتھیار بند ہوکر شعب ابی طالب پہونچے اور محصورین کو وہاں سے نکال لائے۔

عام الحزن — اب بنو ہاشم اور بنو المطلب کو ان آلام و تکالیف سے، تو نجات مل گئی جس میں اب تک مقاطعہ کے باعث وہ مبتلا رہے تھے۔

لیکن اسی برس یعنی سنہ ۱۰ نبوی میں ایک طرف ابوطالب اور دوسری جانب حضرت خدیجہ

کا چند مہینوں کے فصل سے آگے پیچھے انتقال ہوگیا۔ نظر بہ اسباب ظاہری یہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے موجودہ صبر آزما حالات میں بہت بڑا سہارا تھے۔ اور یوں بھی ابوطالب نے جس محبت و شفقت کے ساتھ بچپن میں آپ کی پرورش کی اور عہد شباب میں آپ کے ساتھ ہر قسم کی خیر اندیشی اور خیر سگالی کا معاملہ کیا اور نبوت کے بعد دشمنوں کے مقابلہ میں ہر وقت وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دل و جان سے سینہ سپر رہے ان سب وجوہ کی بنا پر وہ کہنے کو چچا تھے لیکن درحقیقت باپ سے کم نہیں تھے۔ رہیں حضرت خدیجہؓ! تو انہوں نے حضور کے ساتھ جس غیر معمولی محبت، ہمدردی و غم گساری اور امداد و اعانت کا معاملہ کیا تھا اس کی اہمیت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں حضور کو مخاطب کر کے ووجدک عائلاً فاغنیٰ فرما کر اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے اس پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ اس بنا پر ان دونوں کی بیک وقت جدائی کا جو غم اور رنج و ملال ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ حضور نے اس سال کو عام الحزن یعنی غم کا سال فرمایا۔

لیکن جو دنیا کا غم کھانے اور ان کا دکھ درد دور کرنے کیلئے آیا تھا اُسے اپنے فرائضِ منصبی کے ادا کرنے میں اپنے ذاتی رنج و غم کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔ آپ نے اپنا کام جاری رکھا اور اس کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ تیز ہوگئی۔

طائف کا سفر

قریش کی ایذا رسانی اور تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی راہ میں رکاوٹوں اور دشواریوں میں روز بروز شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے باہر دوسرے قبیلوں کو دعوتِ اسلام دینے کا خیال فرمایا۔ مکہ مکرمہ سے پچاس[1] میل کے فاصلہ پر

۱۔ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

طائف تھا۔ یہ نہایت سرسبز و شاداب مقام تھا۔ آب و ہوا بہت عمدہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموؤں کا خاندان عبدیالیل یہیں آباد تھا۔ اس لئے حضور نے اپنے خادم خاص حضرت زید بن حارثہ کے ساتھ اس مقام کا رُخ کیا لیکن یہاں کے رؤسا اور امرا آپ کے ساتھ نہایت گستاخی اور بدتمیزی سے پیش آئے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ آبادی کے چند چھوکروں اور لڑکوں کو آپ کے خلاف ورغلا دیا۔ یہ لوگ دو رویہ صف بنا کر کھڑے ہو گئے۔ اور جب حضور ان کے درمیان میں سے گذرے تو انھوں نے اتنی سخت سنگباری کی کہ آپ کے دونوں پاؤں سے خون کے فوارے چھوٹ پڑے۔ اس عالم میں آپ ایک باغ میں پہنچکر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ لیکن یہاں ربیعہ کے دو لڑکے عتبہ اور شیبہ پہلے سے موجود تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی دشمنی اور اسلام

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ڈاکٹر حمید اللہ نے "عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ" میں صفحہ ۱۰ پر یہی فاصلہ لکھا ہے لیکن ڈاکٹر جواد علی نے تاریخ العرب قبل الاسلام - ج ۴ - ص ۲۰۹ پر ۷۵ میل لکھے ہیں۔ ممکن ہے اِن دونوں میلوں میں وہی فرق ہو جو آج کل میل اور کیلومیٹر میں ہوتا ہے۔ بہرحال طائف مکہ سے جنوب مشرق میں سطح مرتفع پر قائم ہے۔ اور اس زمانہ میں اور اب بھی یہ مکہ کا شملہ ہے یعنی اہل مکہ گرمیوں کا موسم یہیں گذارتے ہیں۔ قرآن مجید میں "القریتین" کا جو لفظ آیا ہے بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مکہ کے ساتھ دوسرا قریہ طائف ہی مراد ہے۔ اسلام کے ظہور کے وقت اس جگہ کے باشندوں کی غالب اکثریت قبیلۂ ثقیف کی طرف منسوب تھی۔ اس قبیلہ کے زعماء نے حضور کے ساتھ یہ سخت ظالمانہ اور بیرحمی کا برتاؤ کیا تھا۔ بنو امیہ کا مشہور سفاک اور ظالم حجاج اسی قبیلہ کا ایک فرد تھا۔

کے خلاف شدید نفرت کا علم تھا۔ انھوں نے آپ کی شان میں نہایت گستاخانہ الفاظ کہے تو آپ یہاں سے بھی اٹھکر واپس ہو گئے۔

جوار | عرب میں باقاعدہ حکومت کا رواج تو تھا نہیں، قبائلی نظام قائم تھا اس بنا پر اگر کسی شخص کو جان و مال کی حفاظت (Protection) درکار ہوتی تھی تو اس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو کسی قبیلہ کے سربراہ اور سردار کی پناہ میں دے دیتا تھا۔ اور عربی میں اس کو ہی جوار کہتے تھے۔ جب تک ابوطالب زندہ رہے حضور ان کی پناہ میں رہے۔ ابوطالب کے انتقال کے بعد خاندان کا بزرگ اور آپ کا چچا ابولہب تھا۔ لیکن یہ پہلے سے ہی آپ کا جانی دشمن تھا۔ چنانچہ ابوطالب اور بنو ہاشم کے ساتھ شعب ابی طالب میں بھی نہیں گیا تھا اور اب حضور کی حفاظت سے دست بردار ہو گیا تھا۔ اس بنا پر مکہ میں رہنے کے لئے حضور کو جوار کی ضرورت تھی۔ ابن اسحاق کا بیان ہے جسے حافظ ابن عبد البر (الدرر ص ۶۵) نے نقل کیا ہے۔ کہ " ان برسوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو مختلف قبیلوں کے سامنے پیش فرماتے اور ان سے جوار کی درخواست کرتے تھے لیکن ان میں کوئی اس پر رضامند نہیں ہوا۔ اور ہر ایک نے یہی جواب دیا کہ وکیف یصلحنا من افسد قومہ یعنی جس شخص نے اپنی ہی قوم میں فساد پیدا کر دیا وہ ہماری اصلاح کیونکر کریگا۔ آخر حضور طائف سے واپسی میں جب حراء تشریف لائے اور یہاں عرب کے ایک سردار مطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف سے یہی درخواست کی تو مطعم فوراً اس کے لئے تیار ہو گئے۔ بیٹوں کو بلا کر حکم دیا کہ ہتھیار بند ہو کر حرم میں جاؤ اور اب وہ خود اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ آیا اور حرم کے پاس کھڑے ہو کر باآواز بلند کہا کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دی ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس واقعہ کو

نقل کرنے کے بعد اپنے قیاس سے لکھا ہے "مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس پناہ دہی کے معاوضہ میں یہ اقرار کرنا پڑا کہ شہر میں تبلیغی تقریریں نہیں کی جائیں گی۔ (عہدِ نبوی کا میدانِ جنگ ص ۱۲) ڈاکٹر صاحب نے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا اور نہ اس طرح کی کوئی شرط کسی کتاب میں ہماری نظر سے گذری ہے۔ اس لئے اگر یہ فقط ڈاکٹر صاحب کا قیاس ہے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ درست نہیں ہے اس میں شک نہیں کہ مطعم بن عدی کی پناہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ میں تبلیغی سرگرمی کا سراغ نہیں ملتا لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ آپ نے جوار کی شرط کے ماتحت اپنے اوپر مکہ میں تبلیغ نہ کرنے کی پابندی عائد کر لی تھی بلکہ اس کے وجوہ حسب ذیل تھے۔

(۱)۔ آپ اہل مکہ کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے اور ان کو ختم اللہ علی قلوبھم --- کا مصداق سمجھتے تھے۔

(۲)۔ مطعم بن عدی آپ کا محسن تھا۔ جس نے اس درجہ سخت صبر آزما حالات میں پناہ دی تھی۔ اس بنا پر آپ کے حسنِ اخلاق اور احسان شناسی کا تقاضہ تھا کہ آپ مکہ میں تبلیغی سرگرمی کو جاری رکھکر مطعم کو کسی شدید ابتلا میں گرفتار نہ ہونے دیں[1]۔

قبائل کا دورہ

ان وجوہ کی بنا پر اب آپ کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ تھا کہ تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے لیے نئے

---

[1] مطعم نے حضور کو صرف پناہ نہیں دی بلکہ جیسا کہ روایات میں ہے اس کا بھی اہتمام کیا کہ مطعم خود اور اسکی اولاد حرم میں مسلح رہتی تھی اور آپ ان لوگوں کی حفاظت میں حرم میں نماز پڑھتے تھے یہی وجہ تھی کہ اگرچہ مطعم مسلمان نہیں ہوا تھا لیکن جب اس کا انتقال ہوا تو حضرت حسان بن ثابت نے اسکا مرثیہ لکھا زرقانی علی المواھب ج ۱۔ ص ۵۱۶۔

گوشے اور نئی جگہیں تلاش کریں چنانچہ آپ نے یہی کیا۔ حج کے زمانے میں سارے عرب سے قبائل آتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مقام منا میں ان قبائل سے ملاقات کرتے ان کو اسلام کی حقیقت سمجھاتے اور اسے قبول کرلینے کی دعوت دیتے تھے۔ اور آپ نے ان لوگوں سے یہ بھی درخواست کی کہ وہ حضور کو اپنے ملک میں لے چلیں تاکہ آپ وہاں تبلیغ واشاعتِ اسلام کا کام اطمینان سے کرسکیں۔ آپ نے ان کو یہ مژدہ بھی سنایا کہ اگر انھوں نے اسلام کو قبول کرلیا تو وہ جلد ہی پورے عرب کے سردار بلکہ قیصر وکسریٰ کے خزانوں کے مالک ہوجائیں گے۔ آپ نے اس سلسلہ میں جن قبائل سے گفتگو کی مورخین نے انکی تعداد پندرہ یا سولہ لکھی ہے۔ اس کے علاوہ عکاظ، المجنہ اور ذوالمجاز عرب کے مشہور میلے جو سالانہ لگتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اِن میلوں ٹھیلوں میں بھی تشریف لے جاتے اور لوگوں کو اپنی دعوت سے روشناس کرتے تھے لیکن قریش کے سردار اور خصوصًا ابولہب ان مواقعوں پر بھی آپ کا تعاقب کرتے اور قبائل کو کبھی ڈرا دھمکا کر، کبھی حضور کا مذاق اڑاکر، غرض جس طرح بن پڑتا حضور کی دعوت کو قبول کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ اور کسی پر اثر نہیں ہوا۔ اور انھوں نے دعوتِ اسلام رد کردی۔ (باقی)

عہدِ نبوی کے غزوات و سرایا اور اُن کے مآخذ پر ایک نظر

از سعید احمد اکبر آبادی

(۲)

اب حج کے موسم میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل سے گفت و شنید اور ان کو دعوتِ اسلام کا پروگرام بنایا تو اُن میں جو لوگ دعوتِ اسلام کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتے تھے ان سے بیعت لینے کے لئے ایک محفوظ جگہ کی ضرورت تھی، اس کے لئے آپ نے عقبہ کا انتخاب فرمایا، عقبہ کے معنی گھاٹی ہیں جو دو پہاڑوں کے بیچ میں ہوتی ہے، ڈاکٹر محمد حمید اللہ جنھوں نے بڑی محنت اور شوق و ذوق سے حجازِ مقدس کے اہم تاریخی مقامات کو خود جا کر دیکھا اور واقعات کی روشنی میں ان کا جغرافیائی جائزہ لے کر اُن کے حدود کا تعین و تشخص کیا ہے اس عقبہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"منیٰ کے قریب راستے کے دونوں طرف پہاڑوں کی ایک مسلسل دیوار ہے، مکہ سے جائیں تو حدودِ منا شروع ہونے کو بمشکل ایک فرلانگ رہتا ہے کہ بائیں ہاتھ پر اس پہاڑی دیوار میں ایک چھوٹا سا خم آتا ہے جو کمان بلکہ نصف دائرہ کی شکل کا ہے اور اتنا بڑا کہ لاہور کی جامع مسجد یا حیدرآباد کی مکہ مسجد مع اپنے صحنوں کے اس کے اندر سما سکیں، یہ مقام عقبہ کہلاتا ہے، اس کے اندر ایک بہت بڑا کنواں ہے اور اندر آج کل زراعت بھی ہوتی ہے، اور جس مقام

پُرشہود بیعت ہائے عقبہ ہوئی تھیں، وہاں ایک کافی بڑی مسجد بھی ہے، جس پر گو چھت نہیں ہے، لیکن قبلہ رُخ اور منا کی سمت کی بیرونی دیوار پر دو قدیم کونی کتبے ہیں۔ جسے آج کل مسجد العشرہ کہتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ یہی مسجدِ بیعتِ عقبہ ہے[1]۔

عقبہ میں تین بیعتیں | یہی وہ مقام ہے جہاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین برس مسلسل تین بیعتیں لی ہیں پہلی بیعت ماہ رجب ۱۱ نبوی میں یثرب (مدینہ) کے قبیلۂ خزرج کے چھ افراد سے لی۔ موسم حج کے موقعے پر یہ لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ عقبہ کے قریب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سے ملاقات ہوئی تو آپ نے حسب معمول ان کو اسلام کی دعوت دی اور قرآنِ مجید کی چند آیات پڑھیں یثرب میں ان لوگوں کا رہن سہن یہود کے ساتھ تھا اور چوں کہ یہ اہلِ کتاب تھے اس لئے ان کو معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آخرالزماں آنے والا ہے، اس بات کا چرچا اور تذکرہ وہ آپس میں کرتے رہتے تھے اور کبھی کبھی اوس اور خزرج کے لوگوں سے بھی کہتے تھے کہ جب وہ پیغمبر آئے گا تو ہم اس کی اطاعت قبول کر کے تم لوگوں پر حکومت کریں گے۔ قرآنِ مجید کی اس آیت میں یہود کی ان باتوں کی طرف ہی اشارہ کیا گیا ہے:۔

وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ	پہلے تو یہ لوگ (یہود) پیغمبر کے ذریعہ کافروں پر فتح پانے کی باتیں کرتے تھے، لیکن جب وہ وقت آگیا جسے یہ جانتے تھے تو یہ پیغمبر کا انکار کر بیٹھے۔

اس بنا پر اب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ حق ترجمان سے ان لوگوں نے اسلام کا پیغام اور قرآن مجید کی آیات سنیں تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے ان کے دل

[1] عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ ص ۱۳

کے دروازہ پر دستک دی ہو۔ وہ بہت متاثر ہوئے، آپس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بولے: ہم کو جلدی کرنی چاہئے، کہیں یہود ہم پر سبقت نہ لے جائیں۔ اور فوراً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کر لی۔

دوسرے برس یعنی ۱۱ نبوی میں موسم حج کے موقع پر بارہ اشخاص آئے، ان میں پانچ تو وہی گزشتہ سال کے تھے، ان کے علاوہ سات نئے تھے، یہ بھی مسلمان ہو گئے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بھی بیعت لی جس کو العقبۃ الثانیہ کہا جاتا ہے۔

تیسرا برس یعنی ۱۲ نبوی۔ ہوا تو اس مرتبہ لوگ کثرت سے آئے، ان میں وہ انصار بھی تھے جو مسلمان ہو چکے تھے اور ان کے علاوہ کافر بھی بڑی تعداد میں تھے، ان میں سے ۷۲ آدمیوں نے جن میں دو عورتیں بھی تھیں شب کے کسی حصہ میں پوشیدہ طور پر عقبہ پہنچ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ اس کو العقبۃ الثالثۃ کہتے ہیں۔[1]

مدینہ میں اسلام کی تبلیغ واشاعت اب اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے مکّہ کا دروازہ بند تھا تو خدا نے اس کے لئے مدینہ کا دروازہ کھول دیا۔ پہلی بیعت کے بعد ہی وہ چھ انصار مدینہ واپس لوٹے تو جاتے ہی انھوں نے اسلام کی تبلیغ واشاعت شروع کر دی یہاں تک کہ ارباب سیر کا بیان ہے کہ مدینہ میں انصار کا ایک گھر بھی ایسا نہیں تھا جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ نہ ہو، پہلی بیعت جن حضرات نے کی تھی وہ سب قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے، دوسری بیعت سے اس دائرہ میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور اس مرتبہ جن لوگوں نے بیعت کی اُن میں دو شخص ابو الہیثم بن التیہان اور عویم بن ساعدۃ قبیلۂ اوس سے تعلق رکھتے تھے، جب یہ لوگ مدینہ واپس ہونے لگے تو آں حضرت صلی اللہ

---

[1] ان تینوں عقبات کا مفصل تذکرہ ابن ہشام، ابن سعد، طبری، ابن عبدالبر، ابن حزم، ابن سید الناس ابن کثیر، اور النویری سب نے کیا ہے اور متعلقہ اشخاص وافراد اور اُن کے قبیلوں کے نام لکھے ہیں۔

علیہ وسلم نے حضرت ابن مکتوم اور حضرت مصعب بن عمیر کو جو المقری القاری (معلم اور قاری) کے لقب سے مشہور ہیں ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ ان کا کام یہ تھا کہ انصار میں جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے ان کو قرآن مجید پڑھاتے، اسلام کے احکام و مسائل کی تعلیم دیتے اور نماز میں امامت کرتے تھے، اس وقت تک نماز جمعہ کی فرضیت کا حکم نہیں ہوا تھا اس کے باوجود حضرت مصعب بن عمیر انصار کو جن کی تعداد اس وقت چالیس تھی مدینہ کے قریب میں بقیع الخضمات نام کی ایک جگہ تھی وہاں جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے، دار قطنی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کی ہے کہ یہ مصعب بن عمیر کا اجتہاد نہیں تھا۔ بلکہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ایما کیا تھا۔

حضرت مصعب صرف معلم اور امام نہیں تھے، بلکہ ان کا فرض اسلام کی تبلیغ و اشاعت بھی تھا، اس فرض کو انھوں نے اس خوبی سے انجام دیا کہ انصار کثرت سے ان کے ہاتھوں پر مسلمان ہوئے یہاں تک کہ اب انصار کا کوئی گھر ایسا نہیں تھا جس میں اکے دکے لوگوں کو چھوڑ کر مسلمان نہ ہوں[1]۔

عقبۂ ثالثہ کے موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ اشخاص کو جن میں نو قبیلۂ خزرج کے تھے اور تین قبیلۂ اوس کے نقبا بھی مقرر فرمایا تھا۔ یہ نقیب کی جمع ہے، نقیب اُس شخص کو کہتے تھے جو اپنے قبیلہ میں سب سے زیادہ ممتاز اور معتمد علیہ ہوتا تھا۔ قبیلہ کے حالات اور ان کے اسرار سے واقف ہوتا تھا اور ضرورت کے وقت ان کی نمائندگی بھی کرتا تھا۔

بیعت کن چیزوں پر لی گئی عقبہ کی ان تینوں بیعتوں کا ذکر تمام کتب سیرت میں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ بیعت کن چیزوں پر لی گئی تھی اور اس معاملہ میں تینوں بیعتوں کا حال یکساں تھا اُن میں فرق ہے اور اگر فرق ہے اور یقیناً ہے تو کیوں ہے حقیقت یہ ہے عقبہ

---

[1] ابن عبدالبر ص ۷۳

اولیٰ کے موقع پر جو بیعت لی گئی اُس کی نسبت حافظ ابن عبدالبر صرف اس قدر لکھتے ہیں

فاسلموا به وبایعوا — یہ لوگ اسلام لے آئے اور انھوں نے بیعت کی[1]

عقبۂ ثانیہ کے موقع پر جو بیعت ہوئی اُس کی نسبت تحریر فرماتے ہیں۔

فبایع رسول اللہ صلی اللہ هؤلاء عند العقبة علی بیعة النساء، ولم یکن أمر بالقتال بعد[2]

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کے پاس ان لوگوں سے ایسی بیعت لی جیسی عورتوں سے لی جاتی ہے اور اب تک جنگ کا حکم نہیں ہوا تھا۔

یعنی یہ بیعت صرف اسلام قبول کرنے پر تھی اور اُس کے بنیادی اجزا یہ تھے کہ بیعت کرنے والا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرے گا۔ سرقہ اور زنا نہیں کرے گا، اولاد کو قتل نہیں کرے گا، کسی پر تہمت نہیں لگائے گا اور احکام خداوندی کی نافرمانی نہیں کرے گا۔

لیکن اب عقبۂ ثالثہ کا موقع آیا تو بیعت کا مضمون بدل جاتا ہے، ابن ہشام کی روایت کے مطابق بیعت کرنے والے نے اپنا ہاتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دیا تو آپ نے فرمایا:۔

"میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم میری حفاظت اسی طرح کرو گے جس طرح تم اپنی عورتوں اور بچّوں کی کرتے ہو" اس کے جواب میں ان میں سے ہر شخص نے کہا: "قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے، ہم آپ کی حفاظت اپنی عورتوں اور بچوں کی طرح کریں گے، یا رسول اللہ! آپ ہماری بیعت قبول فرمائیے۔ ہم لوگ جنگوں کی گود میں پلے اور بڑھے ہیں اور

---

[1] ابن عبدالبر ص ۷۱
[2] ابن عبدالبر ص ۷۲
[3] ابن ہشام ج ۲ ص ۸۴

جنگ آزمائی ہم کو باپ دادا سے ورثہ میں ملی ہے۔

حافظ ابن عبدالبر نے اسی مضمون پر اتنا اور اضافہ کیا ہے :-

وان یحل الیھم ھو واصحابہ — اور نیز اس پر بیعت لی کہ حضور اور آپ کے ساتھی مدینہ چلے جائیں گے۔

اور پھر آگے چل کر کہتے ہیں :-

وکانت البیعۃ لیلۃ العقبۃ الثالثۃ علی حرب الاسود والاحمر، واخذ لنفسہ واشترط علیھم لربہ، وجعل لھم علی الوفاء بذالک الجنۃ، (ص ۹۷)

عقبۂ ثالثہ کی شب میں آپ نے جو بیعت لی تھی، آپ نے خود اپنی حفاظت کا بھی ان سے وعدہ لیا اور اگر انھوں نے یہ وعدہ پورا کیا تو آپ نے اس پر ان کو جنت کی بشارت دی۔

عقبۂ ثالثہ کی اہمیت مورخین وارباب سیر عقبۂ ثالثہ کی بیعت پر سرسری طور پر گذر گئے ہیں، لیکن درحقیقت یہ اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ جو شخص بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نفسیاتی مطالعہ کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ کس واقعہ کا آپ کے ذہن میں کیا تاثر اور کیا ردعمل پیدا ہوا وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اب جب کہ ایک طرف کفار قریش کی شیطنت، فتنہ پردازی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سخت معاندانہ سرگرمیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور دوسری جانب مدینہ میں اسلام کے قدم جم رہے اور اُس کو پھولنے پھلنے کا موقع مل رہا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبۂ ثالثہ کے وقت ہی کفار قریش سے جنگ کرنے اور ابھی سے اُس کی تیاریاں شروع کر دینے کا قطعی فیصلہ کر لیا تھا، یہ صحیح ہے جیسا کہ ابو بکر جصاص نے کتاب احکام القرآن میں نقل کیا ہے، اس پر سب کا اتفاق ہے کہ قتال ہجرت سے پہلے ممنوع

ل ابن ہشام ج ۲ ص ۴۸

یکن جس طرح ہجرت کا حکم بعد میں نازل ہوا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
ن کا فیصلہ پہلے سے کر رکھا تھا، چنانچہ خود عقبۂ ثالثہ کی بیعت میں اس کا ذکر ہے
ـ اسی طرح آیاتِ قتال (۱) وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا
وْا الآیۃ اور (۲) أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ
هِمْ لَقَدِيرٌ[۲] اگرچہ ہجرت کے بعد نازل ہوئیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ
ضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کا منصوبہ ہجرت سے پہلے ہی بنا لیا تھا، البتہ
منصوبہ نے عملی شکل اُسی وقت اختیار کی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو
ۃ اجازت مل گیا۔

کیوں ناگزیر تھی | یہ منصوبۂ جنگ کیا تھا؟ اس کا مفصل تذکرہ تو بعد میں اپنے موقع و محل
ئے گا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے جنگ کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ یہی
وال ہے جس کا صحیح جواب دریافت نہ ہونے کے باعث آں حضرت صلی اللہ علیہ
کے غزوات و سرایا سے متعلق غیر مسلموں میں غلط فہمی پیدا ہوئی اور انھوں نے اسلام
عون کیا اور زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ عام مسلمان تو در کنار بعض علما بھی غلط
سے محفوظ نہ رہے۔

موں کی غلط فہمی | غیر مسلموں کی غلط فہمی کیا تھی؟ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ اسلامی مورخین
ت مغازی کے سلسلہ کا جو واقعہ جس طرح سنتے ہیں روایت کر دیتے ہیں اور راوی
یا طرز روایت کو اپنی رائے کی آمیزش سے محفوظ رکھنے کی غرض واقعہ کا سبب بیان نہیں
، اس طرح احتیاط فی الروایۃ کا حق تو ادا ہو گیا، لیکن اس سے عام ناظرین پر

اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ مگر خبردار! حد سے تجاوز نہ کرنا۔
جو لوگ مظلوم ہونے کی بنا پر جنگ کرتے ہیں ان کو جنگ کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے اور
بے اللہ ان لوگوں کی نصرت پر بہ درجہ قدرت رکھنے والا ہے۔

یا اشھ پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور اُن کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں، صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں، اُسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔ (سیرت النبی ج ۱ ص ۵۸)

بعض علماء کی غلط فہمی | مولانا شبلی نے غیر مسلموں کی جس غلط فہمی کا ذکر کیا، بعینہٖ یہ تو نہیں لیکن بعض علماء نے اسی کے قریب قریب اظہار خیال کیا ہے، مثلاً مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب داناپوری رقمطراز ہیں:-

"جب حق واضح ہوگیا اور باطل ظاہر ہوگیا تو چوں کہ تبلیغ اور حمایت احکام الٰہی جمیع لوازمہ مامور بہ ہے اس لئے سارے کافروں سے کا فتہ وہ ابتدا کریں یا نہ کریں مقاتلہ بھی مامور بہ ہوا۔ بشرطیکہ نیت محض تبلیغ احکام ہو، حق و باطل کے ظاہر ہو جانے کے بعد حق کے لئے مجبور کرنا اور باطل کو جبراً ترک کرانا اکراہ فی الدین نہ ہوا"

اسی سلسلۂ کلام میں آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"آپ (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم) نے شاہانِ عالم اور اقوامِ دنیا کو دعوت توحید دی اور بتا دیا کہ عدم قبول کی حالت میں ہم بامر اللہ جہاد بالسیف پر مامور ہیں۔ جیسا کہ ان خطوں کی عبارتوں سے واضح ہے۔ (اصح السیر ص ۴۱۱)

جنگ کا فیصلہ کرنے کی حقیقی وجہ | اس بناء پر ضروری ہے کہ اس سوال کے جواب پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے قبل ہی جنگ کرنے کا جو فیصلہ کیا اور جس کی تیاری آپ نے عقبۂ ثالثہ سے شروع بھی کر دی اُس کی حقیقی وجہ کیا تھی؟

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی منصب | اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو منصب عطا فرمایا تھا وہ رسالت ہے، یعنی ایک دینِ قیم جو انسان کی دینی اور دنیوی، ظاہری اور باطنی زندگی کے فوز و فلاح کا ضامن اور کفیل تھا آپ اُس کے داعی

اور مبلغ بنا کر بھیجے گئے تھے، لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں نہایت اہم اور یاد رکھنے کی ہیں
(۱) ایک یہ کہ جہاں تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت اور اس کے متعلقہ امور کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو قرآن مجید میں بار بار بڑی شدت اور قوت سے بیان فرمایا اور حضور کو اس طرف متوجہ کیا ہے: مثلاً - قم فانذر: آپ کھڑے ہو جیئے اور عذاب الٰہی سے ڈرا دیئے، بلغ ما انزل الیك: جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے اس کی تبلیغ کیجئے، فاصدع بما تومر: جن چیزوں کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے دا شگاف بیان کیجئے،

(۲) دوسری یہ کہ تبلیغ و تذکیر اور دعوت و ارشاد کے حکم کے ساتھ تکرار و تاکید کے پیرایہ بیان میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی جتا دیا گیا ہے کہ ہدایت و ضلالت کی کنجی اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، اور اس کا دارو مدار ہر انسان کی اپنی فطری استعداد و صلاحیت پر ہے اس لئے آپ کا جو کام ہے وہ کرتے رہیئے اور اس مخمصہ میں ہرگز نہ پڑیئے کہ کون آپ کی دعوت کو قبول کرتا ہے اور کون نہیں کرتا ان سب کا معاملہ خدا کے سپرد ہے:- چنانچہ فرمایا گیا:-

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝ إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۝ (الغاشیہ)

پس اے محمدؐ آپ ان کو سمجھا دیئے، اور آپ تو صرف سمجھانے والے ہی ہیں اور ان لوگوں پر کوئی داروغہ تو نہیں ہیں، مگر ہاں! ان میں جو لوگ روگردانی اور کفر کریں گے، اللہ ان کو بڑا عذاب دے گا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:-

فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ (آل عمران)

پھر یہ لوگ اگر مسلمان ہو گئے تو ہدایت یاب ہو گئے، اور اگر انھوں نے روگردانی کی تو آپ

کو اس سے کیا) آپ کا فرض تو صرف ابلاغ ہے

ایک آیت میں آپ کو یاد دلایا گیا :۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ○ البقرہ

ہم نے تو بے شبہ آپ کو حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، اور اصحابِ دوزخ کی نسبت آپ سے بازپرس نہ ہوگی۔

ایک آیت میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسرے مبلغین و داعیانِ حق کے لئے ایک عام اصول اور کلیہ کے طور پر بیان کیا گیا۔

لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

جب تم ہدایت پر ہو تو جو لوگ گمراہ ہیں وہ تمھارا کیا بگاڑ لیں گے۔

ہدایت اور ضلالت بے شک اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، لیکن جو لوگ بار بار کی تذکیر اور انذار و تبشیر کے باوجود پیغامِ حق کو قبول نہیں کرتے تھے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمتِ عالم ہونے کے باعث اُس کا سخت صدمہ اور ملال ہونا تو ایک امرِ طبعی تھا ہی، ملاحظہ فرمایئے اللہ تعالیٰ کس شفقت آمیز تہدید کے پیرایہ میں اس صدمہ کو حضور کے دل سے دور کرنا چاہتا ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا

(الکھف)

اگر یہ لوگ ان باتوں پر ایمان نہ لائے تو شاید آپ افسوس کے مارے اپنا جی ہلکان کر دیں گے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا :۔

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ (النمل)

آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور آپ نپٹ بہروں کو بھی اپنی پکار نہیں سنا سکتے جب یہ روگرداں ہو کر اور پیٹھ پھیر کر چلتے ہیں۔

ایک اور مقام پر فرمایا گیا :-

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (القصص)	جس کو آپ چاہیں، ہدایت نہیں دے سکتے، لیکن ہاں! اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے،

اچھا! اگر لوگ آپ کی دعوت قبول نہ کریں اور آپ کے پیغام پر کان نہ دھریں تو اس حالت میں حضور کو کیا کرنا چاہیئے؟ اللہ تعالیٰ نے اس سوال کا جواب بھی پردۂ راز میں نہیں رکھا۔ صاف ارشاد ہوا :-

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔ (التوبہ)	اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو آپ کہئے: "مجھ کو اللہ کافی ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، میں نے اُس پر بھروسہ کیا ہے اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔

اور یہ آیت تو پہلے بھی آچکی ہے :-

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ	اگر یہ روگردانی کریں تو بہر حال آپ کا فرض تو صرف ابلاغ ہی ہے۔

یہ جو کچھ آپ نے پڑھا اُس سے بلا شائبۂ ریب و شک یہ صاف ظاہر ہے کہ بحیثیت رسول اللہ ہونے کے آپ کا فرض منصبی صرف ابلاغ - دعوت اور تذکیر تھا اور آپ یہ دیکھنے کے ہرگز مکلف نہیں تھے کہ کون آپ کا پیغام قبول کرتا ہے اور کون قبول نہیں کرتا۔ کون ایمان لاتا ہے اور کون کفر پر قائم رہتا ہے پس جب کسی شخص کے مسلمان ہونے نہ ہونے کی ذمہ داری اور مسئولیت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد ہی نہیں ہوتی تو ظاہر ہے اسلام کے قبول نہ کرنے پر جنگ کرنا یا کسی کو اُس کے قبول کرنے پر مجبور کرنا اسلام میں کیونکر جائز ہو سکتا ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم

جن کی پوری حیات طیبہ قرآن کی عملی تفسیر ہے آپ سے اس کا صدور کیوں کر ممکن ہے۔

دین میں جبر نہیں | جو لوگ اسلام میں جبر کی بات کرتے ہیں، خواہ وہ غیر مسلم ہوں یا مسلمان، وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اسلام کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ جبر کے ساتھ جمع ہو ہی نہیں سکتا، کیوں کہ اسلام میں ایمان کی پہلی شرط ہے تصدیق بالجنان، یعنی دل سے سچ جاننا۔ اور ظاہر ہے جبر سے یہ تصدیق حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ) — دین میں زبردستی کا کیا سوال؟ حق تو باطل سے صاف صاف متمیز ہو چکا ہے۔

علامہ سید رشید رضا تفسیر المنار میں اسی موقعے پر لکھتے ہیں:-

قاعدۃ کبریٰ من قواعد دین الاسلام ورکن عظیم من ارکان سیاستہ فھو لا یجوز اکراہ احد علی الدخول فیہ (بحوالہ تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۱۰۰) — یہ آیت دین اسلام کے ایک اہم ضابطہ اور اسلامی سیاست کے ایک عظیم رکن کی نشاندہی کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونے پر کسی کو مجبور کرنا جائز نہیں ہے۔

علامہ ابن جوزی نے اس آیت کے اسباب نزول تین لکھے ہیں، لیکن سب سے زیادہ قوی اور قابل ترجیح جو سبب ہے وہ یہ ہے کہ جب بنو نضیر کو مدینہ سے جلا وطن کیا گیا تو ان لوگوں میں انصار کے چند بیٹے بھی تھے، انصار نے کہا: ہم اپنے بیٹوں کو یہود کے ساتھ نہیں جانے دیں گے اور ان کو اسلام پر مجبور کریں گے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (زاد المسیر فی علم التفسیر ج ۱ ص ۳۰۵)[1]

بہر حال یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ کے

---

[1] جن چند حضرات نے آیت کے ان دو لفظوں کے متعلق خواہ مخواہ ناسخ و منسوخ کی بحث اٹھائی ہے اس موقع پر ان کی نسبت اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

اف جنگ کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ ہرگز اس لئے نہیں تھا کہ یہ لوگ دعوتِ اسلام کو
دل کیوں نہیں کرتے اور دینِ قیم کے حلقہ بگوش کیوں نہیں بنتے، بلکہ یہ فیصلہ اس پر مبنی تھا کہ
بحیثیت پیغمبر کے آپ کا جو فرضِ منصبی ہے، یعنی ابلاغ، دعوت، تذکیر اور انذار و تبشیر
لوگ اسے انجام نہیں دینے دیتے، اُس میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں، حضور
تذلیل و توہین، استہزاء و تمسخر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے، جو لوگ مسلمان ہو گئے
ں ان کا جینا مشکل کر دیا ہے، دینِ حق کے ساتھ دشمنی کی انتہا ہے کہ اس دین کے داعی کے
تل کر دینے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں، مطعم بن عدی کی پناہ میں آنے کے بعد حضور
نے مکہ سے باہر فریضۂ رسالت کو انجام دینا شروع کیا ہے تو ان ظالموں نے یہاں بھی پیچھا
ہیں چھوڑا۔ آپ جہاں جاتے ہیں یہ بھی پہنچ جاتے ہیں، اور جن لوگوں سے آپ خطاب فرماتے
یں ان کو طرح طرح سے ورغلاتے، ڈراتے اور دھمکاتے ہیں، حضور کے خلاف اُن کو بھڑکانے
ور مشتعل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عصبیتِ جاہلیہ کیا بُری شے ہے کہ انسان دن کو شبِ تاریک کہنے پر مجبور ہو جاتا
ہے، ورنہ وہ لوگ جو غزواتِ نبوی پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں اگر اُن میں ذرا بھی انصاف
سندی اور حق شناسی کی رمق ہو تو انھیں اور ان کے ساتھ ساری دنیا کو آں حضرت صلی اللہ علیہ
سلم کے اس عظیم احسان کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ آپ نے سخت ترین لڑائیاں لڑ کر انسان کے لئے
ضمیر کی آزادی، عقیدہ کی آزادی، عمل کی آزادی، اور اظہار و بیان کی آزادی کی راہیں کشادہ
یں اور صدیوں کی جہالت اور تعصب نے انسانی فکر و ذہن کو جمود و بے حسی، غلط بینی و غلط
اندیشی کی جن زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا انھیں پاش پاش کیا، جب تک ایسا نہ ہوتا نہ انسانی
تہذیب و تمدن میں ترقی ہو سکتی تھی، نہ علوم و فنون میں ارتقاء ہو سکتا تھا اور سب سے بڑھ
ر یہ کہ انسان اپنی انسانیت کی متاعِ گم شدہ کو واپس نہیں پا سکتا تھا آج یورپ کو اپنے عہدِ تعقل
ز (THE AGE OF REASON) پر فخر ہے، جس کا آغاز سولھویں صدی سے ہوتا ہے،

لیکن اس عہد کا اصل سرچشمہ کہاں ہے، سب سے پہلے کس نے انسانی عقل و شعور کو جھنجوڑا۔ اسے النفس و آفاق میں غور کرنے کی دعوت دی، وہ کون ہے جس نے انسان کو احساس کمتری سے اس عہد تعقل سے بھی صدیوں پہلے نجات دی اور اُس کے حقیقی شرف و مجد کا اعلان کیا، مجلس اقوام متحدہ کی "دستاویز حقوقِ انسانی" عہدِ جدید کے انسان کا مقدس صحیفۂ اخلاق ہے لیکن اعلیٰ مکارم و اخلاق جنھوں نے وحشیوں کو دنیا کی شائستہ ترین قوم بنا دیا ان کا صور سب سے پہلے کس نے پھونکا! سوچنا چاہئے کہ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم عصبیتِ جاہلیہ کے خلاف جنگ کرکے اسے ختم نہ کردیتے تو انسانی تہذیب و تمدن اور کائناتِ عالم میں غور و فکر کا کاروان ترقی کی کس منزل میں ہوتا؟

ایک شبہ اور اس کا ازالہ آپ اوپر پڑھ آئے ہیں کہ عقبۂ ثالثہ کی بیعت کے سلسلہ میں حافظ ابن عبدالبر نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ:

وکانت البیعة علی حرب الاسود والاحمر	اور یہ بیعت کالے اور گورے سب سے جنگ کرنے پر لی گئی تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ کفار قریش سے جنگ کرنے کے تو اسباب و وجوہ موجود تھے لیکن دنیا کے سب لوگوں نے کیا قصور کیا تھا جس کی وجہ سے حضور نے اُن سب کے خلاف جنگ کرنے کی بیعت لی!

جواب یہ ہے کہ جملۂ زیر بحث عربی زبان کا ایک محاورہ ہے اور اردو میں اس کا صحیح ترجمہ ہوگا۔ عرب و عجم سے لڑائی مول لینے پر، نہ کہ "جنگ لڑنے پر" قاعدہ ہے کہ کوئی شخص کسی کی محبت اور عشق میں دیوانہ ہوجاتا ہے اور اپنے محبوب کی مرضی کے سوا کسی اور کی پرواہی نہیں کرتا، یا ایک شخص کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دینے کے لئے کمربستہ ہوتا ہے اور اپنی دُھن میں کسی کی نہیں سُنتا، کسی کی رائے اور مشورہ قبول نہیں کرتا تو کہتے ہیں: "اس شخص نے ساری دنیا سے لڑائی مول لے لی ہے" پس اسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس وقت یہ ارشاد فرما کر بیعت کرنے والوں کو یہ جتانا چاہا کہ وہ اسلام کو قبول کرکے جس راہ پر گامزن ہو رہے ہیں اُن کو سمجھنا چاہیئے کہ یہ راہ آسان نہیں ہے، اس میں کانٹے بچھے ہوتے ہیں، قدم قدم پر ان کی سخت مخالفت ہوگی، ان کو ہر مرحلہ پر دشمنوں سے سابقہ ہوگا، ان کو تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلنی ہوں گی اور جان و مال کی قربانی پیش کرنی ہوگی۔ اگر وہ اس راہ پر عزم و استقلال اور ثابت قدمی سے جمے رہے تو اللہ تعالیٰ ان کو اس کا انعام دے گا، اور زمین و آسمان کے خزانے ان کے لئے اپنے دروازے کھول دیں گے۔ حضور کو یقین تھا کہ چوں کہ اسلام کو دُنیا کے ہر گوشے میں پہنچنا ہے اس بنا پر آج مکہ میں جو صورتِ حال پیش آئی کل پورے عرب و عجم میں اس کو یہی صورتِ حال پیش آئے گی اور اُس سے بھی اسی طرح نبٹنا ہوگا جس طرح اب مکہ کے لوگوں سے نبٹنا ہے، اسی بنا پر حضور کے اس ارشاد کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ خواہ مخواہ ساری دنیا سے جنگ کرنی ہے، بلکہ مقصد آیندہ کے خطرات اور دشواریوں کی طرف متوجہ کرکے ان لوگوں کو انھیں انگیز کرنے اور حسب تقاضائے وقت و مصلحت ان سے عہدہ برآ ہونے پر آمادہ و مستعد کرنا تھا۔

<u>ہجرت کی تیاری</u> اب جب کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا آپ کے لئے مکہ سے ہجرت کر جانا ضروری تھا۔ چنانچہ آپ نے ہجرت کا عزمِ صمیم کر لیا لیکن رحمتِ عالم کو اپنے سے زیادہ فکر دوسروں کی رہتی تھی۔ اس لئے آپ نے عقبۂ ثالثہ کی بیعت کے بعد ہی جس کا علم کفار کو نہیں تھا۔ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دے دیا۔[۱]

(باقی)

---

[۱] ہجرت کے حکم کے بارہ میں حسب معمول علما کا اختلاف ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ اگرچہ ہجرت اسلام کے لئے شرط نہیں تھی، لیکن اس وقت فرض کر دی گئی تھی اور اُس کی وجہ جیسا کہ لوگوں کا عام خیال ہے یہ نہیں تھی کہ مسلمانوں کو گوشۂ عافیت، درکار تھا۔ بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ ہجرت کفار مکہ کے ساتھ جنگ کے منصوبہ کا ایک جزو اور "کلمۃ اللہ" کو کفار کے قبضہ سے نکال لینے کا پیش خیمہ تھی، چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے والذین آمنوا ولم یہاجروا ما لکم من ولایتہم من شیء حتی یہاجروا وہ لوگ جو ایمان لائے لیکن ہجرت نہیں کی ان کی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ مگر ہاں اُس وقت جب وہ ہجرت کریں۔

عہدِ نبوی کے
غزوات وسرایا اور اُن کے مآخذ پر ایک نظر

از سعید احمد اکبرآبادی

(۳)

حافظ ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ عقبۂ ثالثہ کی بیعت ختم ہو جانے کے بعد ہی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کا حکم دیا تو سب سے پہلے[1] ابوسلمۃ بن عبدالاسد المخزومیؓ روانہ ہوئے۔ ان کی بیوی ام سلمۂ بنت ابی امیہ اس وقت ان کے ساتھ نہیں جا سکی تھیں۔ یہ مکہ میں ہی رہ گئیں، کم وبیش ایک برس کے بعد جب ان کو اجازت ملی تو عثمان بن ابی طلحہ جو اَب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے انھوں نے اُن کو اپنی حفاظت میں مدینہ پہنچایا۔ ابوسلمہ کی ہجرت کے بعد مسلمان مردوں اور عورتوں کے قافلے یکے بعد دیگرے روانہ ہوتے۔ یہ سب حضرات عزیز قریب، مال ومتاع جاگیر اور جائداد۔ غرض اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ چھوڑ کر بے سروسامان چلے جا رہے تھے اور ان کی حالت اس وقت مولانا محمد علی مرحوم کے اس شعر کا مصداق تھی:۔

میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا　　سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

---

[1] بعض روایات میں ہے کہ سب سے پہلے مہاجر مصعب بن عمیر ہیں

ان مہاجرین میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت حمزہؓ، حضرت زبیرؓ بن عوام، اور خواتین میں حضرت زینب بنتِ جحشؓ اور ان کی دونوں بہنیں بھی تھیں، مدینہ میں انصار کی آبادی منتشر تھی، ان کا ایک قبیلہ بنی عمرو بن عوف قبا میں آباد تھا جو مدینہ سے تین میل کی مسافت پر تھا۔ اکثر مہاجرین نے قیام یہیں کیا۔ بعض حضرات عوالی میں مقیم ہوئے، کوئی کسی کے پاس ٹھہرا اور کوئی کسی کا مہمان ہوا[1]۔ غرض اب تک جو مرد اور عورتیں مسلمان ہو چکے تھے اور مکہ میں موجود تھے، وہ سب ایک ایک کر کے خاموشی سے مدینہ پہنچ گئے۔

اب مکہ میں صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے تھے جو مسلمان افلاس وتنگدستی یا کسی اور مجبوری کے باعث ہجرت نہ کر سکے تھے، قرآن مجید میں ان کی نسبت ارشاد ہوا:۔

وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ	اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا	(تم کیوں جنگ نہیں کرتے) جو کہتے ہیں کہ اے
مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا	ہمارے پروردگار تو ہمیں اس آبادی سے نکال
مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ	جس کے باشندے ظالم ہیں۔ اے رب تو خود ہی
نَصِيْرًا۔ (النساء)	کسی کو اپنی طرف سے ہمارا حامی اور مددگار بنا

ہجرت نبوی اب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہجرت سے مانع کیا امر ہو سکتا تھا لیکن آپ حکم الٰہی کے منتظر تھے اور ادھر اللہ تعالیٰ کو کفارِ قریش پر اپنی حجت کو تمام کرنا تھا۔ اُس کی صورت

---

[1] حافظ ابن عبد البر نے اور ان کے تتبع میں ابن حزم نے مجموع السیر میں ان مہاجرین اور مہاجرات کے نام لکھے ہیں، لیکن اس سے صحیح تعداد کا پتہ نہیں چل سکتا، کیوں کہ ان کے لکھنے کا انداز یہ ہے مثلاً: بنو جحش کے ساتھ بنو اسد کی ایک جماعت نے بھی ہجرت کی اور ان میں یہ اصحاب بھی تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر قبیلہ کے نمایاں مردوں اور عورتوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

یہ ہوئی کہ عقبۂ ثالثہ میں بیعت اور مدینہ کی طرف ہجرت کا فیصلہ اس خاموشی کے ساتھ ہوا تھا کہ قریش تو درکنار انصار میں بھی اب تک جو لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے انھیں بھی کانوں کان اس کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ ابن ہشام اور دوسرے ارباب سیر کا بیان ہے کہ آخر کار جب انھیں اس کا علم ہوا کہ انصار میں ایک بڑی تعداد مسلمان ہوگئی ہے اور مکہ میں پہلے سے جو مسلمان تھے وہ بھی سب مدینہ پہنچ گئے ہیں اور اس طرح اسلام کے قدم مدینہ میں مضبوط ہوگئے ہیں تو چوں کہ قریش کے تجارتی قافلے جو شام آتے جاتے تھے، مدینہ طیبہ ان کی گذرگاہ میں پڑتا تھا اس بنا پر ان کو اندیشہ ہوا کہ مسلمان ان قافلوں سے تعرض کریں گے۔ ظاہر ہے یہ معاملہ ان کے لئے موت وحیات کا مسئلہ تھا۔ اس لئے انھوں نے دار الندوہ میں ایک مجلس مشاورت منعقد کی، قریش کے تمام اکابر اور ارباب رائے موجود تھے، اصل معاملہ پر جب بحث ہوئی تو ابو البختری بن ہشام نے رائے دی کہ حضور کو قید کر دیا جائے، ابو الاسود ربیعہ بن عمیر نے کہا کہ آپ کو جلا وطن کیا جائے، لیکن مجمع نے ان دونوں رایوں کو رد کر دیا اور آپ کے قتل کر دینے پر سب متفق ہو گئے، اس کی صورت انھوں نے یہ نکالی کہ قریش کے ماتحت جو چھوٹے چھوٹے قبیلے ہیں اُن میں سے ہر قبیلہ اپنا ایک بہادر نوجوان منتخب کرے اور یہ سب بیک وقت حضور پر حملہ آور ہو کر (شُلّت ایدیہم) آپ کا کام تمام کر دیں۔ اس طرح بنو ہاشم کا سب سے مقابلہ کرنا دشوار ہوگا۔

اور اگر خون بہا دینا بھی پڑا تو وہ سب پر تقسیم ہو جائے گا، ادھر ان لوگوں نے یہ منصوبہ تیار کیا اور اُدھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ترک وطن کا حکم دیا۔ چنانچہ جس شب میں ان لوگوں نے کاشانۂ نبوی کا محاصرہ کیا کہ صبح کو آپ گھر سے نکلیں گے تو یہ اپنے ارادہ کی تکمیل کریں گے اسی شب میں آپ کے پاس لوگوں کی جو امانتیں تھیں انھیں حضرت علیؓ کے سپرد کیا کہ وہ ان کے مالکوں کو واپس کر دیں اور پھر مدینہ کا ارادہ کریں اور اُنھیں اپنے بستر پر لٹا کر شب کے آخری حصہ میں جب کہ عموماً نیند کا غلبہ ہوتا ہے، آپ مکان کی اس کھڑکی (خوخۃ) سے جو حضرت ابو بکرؓ کے مکان کی پشت کی جانب کھلتی تھی، باہر تشریف لائے۔ حضرت ابو بکرؓ کے مکان پر پہنچے، وہ پہلے سے چشم براہ تھے اور کئی مہینے سے دو

ونٹنیوں کو خوب کھلا پلا کر تیار کر رکھا تھا۔ انھوں نے عرض کیا: حضور! ایک اونٹنی آپ پسند فرمائیں"
ارشادِ گرامی ہوا: بہت اچھا! مگر قیمت لینی ہوگی[1]۔ صدیق اکبرؓ کو انکار کی کیا مجال ہو سکتی تھی" چوں کہ
پروگرام یہ تھا کہ آپ اور حضرت ابوبکرؓ دونوں تین روز تک غارِ ثور میں روپوش رہیں گے اس لئے
عبداللہ بن اریقط جو اگرچہ کافر تھا مگر آپ نے اُس کو مدینہ کے سفر میں رہنمائی کے لئے مقرر فرمایا تھا۔
دونوں اونٹنیاں اُس کے سپرد کیں اور آپ کعبہ پر حسرت کی نگاہ ڈال اور اسے الوداع کہہ کر مکہ سے
روانہ ہوگئے، تین روز غارِ ثور میں قیام فرمایا۔ اس کے بعد عبداللہ بن اریقط حسبِ قرار داد
دونوں اونٹنیاں لے کر آگیا تو آپ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور اُن کے غلام عامر بن فہیرہ کی معیت
اور عبداللہ بن اریقط کی رہنمائی میں روانہ ہوئے، اربابِ سیر نے اس سفر کی ایک ایک منزل کی
روئداد نقل کی ہے، لیکن یہاں اُس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے، بہر حال عجیب منظر تھا ایک
شہنشاہِ عرب و عجم اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ نامانوس وادیوں کے نشیب و فراز سے گذرتا
اور دشت و جبل کی خاموشیوں کو اپنی سواریوں کی رفتار سے جگاتا روانہ چلا جا رہا تھا اور مبدأ
فیاض کے حریم قدس سے دشمنوں کی سعی ناکام پر یہ اعلانِ عام ہو رہا تھا۔

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۝

(الانفال)

اور اے محمدؐ آپ اُس وقت کو یاد کیجئے جب کفار آپ کے متعلق یہ داؤ چلنا چاہتے تھے کہ وہ آپ کو گرفتار کر لیں، قتل کر دیں یا جلا وطن کر دیں، تو وہ اپنی جیسی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

---

[1] آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اصرار سے اُن علماء و مشائخ کو عبرت ہونی چاہئے جو اپنے مریدوں اور معتقدوں کی آمدنی کے بل بوتہ پر عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے اور امیرانہ طرز بود و ماند رکھتے ہیں۔

بارہ تیرہ دن میں یہ سفر تمام ہوا تو آپ بروز دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول کو قبا میں داخل ہو کر قبیلہ بنو عمرو بن عوف کے ایک سردار کلثوم بن الہدم کے مہمان اور حضرت ابوبکرؓ خبیب بن اساف جو بنو الحارث بن الخزرج سے تعلق رکھتے تھے اُن کے ہاں قیام فرما ہوئے، یہاں دو ہفتہ قیام کے بعد آپ شہر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے، یہ جمعہ کا دن تھا، محلہ بنو سالم سے گذر رہے تھے کہ نماز جمعہ کا وقت ہو گیا، آپ نے نماز یہیں ادا کی اور خطبہ دیا۔ یہ پہلی نماز جمعہ تھی جو آپ نے پڑھی، اس کے بعد آپ پھر جب روانہ ہوئے اور شہر میں داخل ہوئے تو مختلف حضرات کا اصرار تھا کہ حضور میزبانی کا شرف ان کو عطا فرمائیں۔ لیکن آپ نے اس معاملہ میں حَکَم اپنی اونٹنی کو بنا دیا کہ وہ جہاں بیٹھ جائے گی آپ وہیں قیام فرمائیں گے۔ اونٹنی چلتی رہی اور آخر کار جہاں اب مسجدِ نبوی ہے اُس سے متصل حضرت ابوایوب انصاری کا مکان تھا۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ بنو نجار سے تھے اور حضورؐ کے ساتھ ان لوگوں کا ددھیالی رشتہ تھا۔ ناقہ انھیں کے مکان کے سامنے آکر بیٹھی اور حضورؐ نے حضرت ابوایوب انصاری کو شرفِ میزبانی سے نوازا۔ ساتویں مہینے آپ کا مکان جس کی کل کائنات کچی اینٹیں۔ کھجور کے پتے اور ٹہنیاں تھیں تعمیر ہو گیا تو آپ اس میں منتقل ہو گئے، بعد میں حسب ضرورت اس میں اضافہ ہوتا رہا۔

مواخات | اب سماجی اور اقتصادی اعتبار سے سب سے بڑا مسئلہ مہاجرین کی آبادکاری کا تھا آج جب کہ تہذیب و تمدن اور وسائلِ معیشت میں ترقی کے اعتبار سے دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے پناہ گزینوں کی آبادکاری کا معاملہ اور اُس سے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل پیدا ہوتے ہیں وہ اقوامِ عالم کے لئے دردِ سر بنے ہوتے ہیں اور اُن کے حل کے لئے

لہ اکثر مورخینِ سیرت نے قبا میں داخلہ کی تاریخ ۸ ربیع الاول ۱ نبوی لکھی ہے لیکن حافظ ابن عبدالبر نے بارہ لکھی ہے اور ہمارے نزدیک مکہ سے روانگی کی تاریخ، غارِ ثور میں قیام اور سفر کی منزلوں کی تعداد کے پیشِ نظر یہی قرین قیاس ہے۔

مجلس اقوام متحدہ کے ماتحت ایک مستقل شعبہ ہے، اس لئے دیکھنا چاہیئے کہ اس اہم مسئلہ کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس خوش اسلوبی سے اور کس قدر جلد حل فرمایا۔ بقول مولانا شبلی کے کوئی شبہ نہیں کہ یہ بھی شانِ نبوت کی خصوصیات میں سے ہے، (سیرت النبی ج ا ص ۲۹۰)
اس لئے ہم بھی اس داستان کو ذرا تفصیل سے سناتے ہیں۔

مواخات کی حکمت | جیسا کہ آج کل بھی عام قاعدہ ہے آباد کاری کی ایک یہ شکل بھی ہو سکتی تھی کہ ان کے لئے الگ زمینیں خرید کر مکانات بنوا دیتے جاتے اور معاش کے لئے کاروبار یا کھیتی باڑی کا انتظام کیا جاتا۔ اور اس مقصد کے لئے جتنے سرمایہ کی ضرورت ہوتی اُس کا کچھ بندوبست تو خود بعض مہاجرین بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ خود حضرت ابوبکرؓ جب مدینہ پہنچے ہیں تو چالیس ہزار درہم آپ کے ساتھ تھے۔ اور یہی حال بعض اور متمول مہاجرین کا تھا۔ اور مزید رقم جو درکار ہوتی اُس کا انتظام انصار بطیب خاطر کر سکتے تھے۔ لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آبادکاری کے اس طریقہ کے بجائے مواخات کی صورت اختیار فرمائی! اس میں مندرجہ ذیل حکمتیں اور مصلحتیں آپ کے پیشِ نظر تھیں:۔

(۱) مہاجر قدیم الاسلام اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پُرانے صحبت و تربیت یافتہ تھے اور اُن کے بالمقابل انصار نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، اس بنا پر حضور نے چاہا کہ دونوں ایک گھر میں رہیں گے تو اس سے انصار کو دینی تعلیم و تربیت میں بہت کچھ مدد ملے گی۔

(۲) مہاجر اور انصار اگرچہ اسلام کے رشتہ وحدت سے منسلک تھے، لیکن طبیعت کی افتاد اور مزاج کے اعتبار سے دونوں میں بہت فرق تھا۔ مہاجرین تجارت پیشہ لوگ تھے۔ نظم ونسق کی صلاحیت بھی ان میں بہت اچھی تھی اور ان کا معیارِ زندگی اونچا تھا۔ اس کے برخلاف انصار مجموعی حیثیت سے فلاحت و زراعت کا پیشہ رکھتے تھے اور یہ ظاہر ہے ان دونوں طبقوں کا مزاج اور طبیعت یکساں نہیں ہوتے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ دونوں ہر وقت اک ساتھ رہیں گے تو اختلافِ طبع کی خلیج بہت کم ہو جائے گی۔

(۳) دنیا کو نبی اُمّی کی سیاسی دانشمندی اور دوراندیشی کی قسم کھانی چاہیئے، آپ کو یہ محسوس ہوا کہ انصار جس ماحول میں رہتے ہیں اُس کے پیش نظر بعید نہیں کہ انھیں کے کنبہ برادری میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو منافق ہو کر اسلام اور مسلمانوں کے لئے مار آستین ثابت ہوں (چنانچہ بعد میں ایسا ہوا بھی) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ انصار اور مہاجر دونوں ایک جگہ اور ایک ہی گھر میں رہیں گے تو منافقوں کو من مانی کرنے کا موقع زیادہ نہیں ملے گا اور اسلام کے خلاف ان کی خفیہ ریشہ دوانیاں پردۂ راز میں نہ رہ سکیں گی۔

(۴) مہاجر قبیلے دو قبیلے تھے، یہی حال انصار کا تھا۔ اوس اور خزرج تو بڑے قبیلے تھے جن میں عرصہ سے شدید کشمکش چلی آرہی تھی، ان کے علاوہ اور چھوٹے چھوٹے قبیلے مثلاً عبدالاشہل، زفر، حارثہ، عمرو بن عوف، اوس منات، بنو نجار، الحارث، بعل الحبلی اور قواقلہ، مساعدہ سلیمہ زریق، بیاضہ وغیرہ تھے جن میں باہم سیاسی رقابت اور چشمک تھی، اس بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ مہاجرین جو اسلام کی تعلیمات میں منجھے ہوئے ہیں انصار شب و روز اُن کے ساتھ یکجا رہیں گے تو عہد جاہلیت کی یہ یادگاریں اُن کے دل و دماغ کی لوح سے یکسر محو ہو جائیں گی اور وہ سب اللہ کے مومنِ قانت و مخلص بندے بن جائیں گے[1]

(۵) اس مقصد کے پیشِ نظر مواخات صرف انصار و مہاجرین تک محدود نہ تھی۔ بلکہ بعض مہاجر مہاجر کے اور بعض انصار خود انصار کے بھائی بنائے گئے۔

مواخات دو مرتبہ ہوئی | یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مواخات دو مرتبہ ہوئی ہے، ایک تو یہی جو مشہور ہے

---

[1] اب ذرا اس پس منظر میں غور کیجئے کہ بنگلہ دیش کیوں بنا؟ اور آج پاکستان میں مہاجرین کا کیا حال ہے؟ اور ان سب حالات کی وجہ سے آج پاکستان اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے کیوں گذر رہا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے صرف عبادات میں اسوۂ حسنہ ہیں اور (معاذ اللہ) معاملات اور سیاسیات اور معاشیات میں نہیں ہیں۔

اور جس کا ذکر ابن ہشام، ابن سعد، امام بخاری، ابن حبیب، ابن کثیر، ابن عبد البر، ابن سید الناس، وغیرہ سب نے کیا ہے، یہ مواخات ورود مدینہ کے پانچ ماہ بعد انجام پذیر ہوئی، لیکن ابن عبد البر (ص ۱۰۰) اور اُن کے تتبع میں ابن سید الناس (جلد اول ص ۱۹۹) نے اس مواخات کے علاوہ ایک اور مواخات کا تذکرہ کیا ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے قبل (۱) حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ (۲) حضرت حمزہؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ، (۳) حضرت عثمانؓ اور حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف (۴) حضرت زبیرؓ اور حضرت عبد اللہؓ بن مسعود، (۵) حضرت عبیدہؓ بن الحارث اور حضرت بلالؓ (۶) حضرت مصعبؓ بن عمیر اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص (۷) حضرت ابو عبیدہؓ اور حضرت سالم مولی ابی حذیفہ۔ (۸) حضرت سعیدؓ بن زید اور حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ میں کرائی تھی اس مواخات میں یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہے کہ مندرجہ بالا فہرست میں حضرت بلال اور حضرت سالم دونوں آزاد کردہ غلام ہیں اور اُن کی مواخات اُن حضرات کے ساتھ کرائی جارہی ہے جو قریش کے معزز افراد ہیں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس مواخات میں کیا حکمت و مصلحت تھی۔

دونوں میں فرق | لیکن دونوں مواخاتوں میں بہت بڑا فرق ہے جیسا کہ ابن عبد البر نے لکھا ہے پہلی مواخات حق اور مواسات پر مبنی تھی لیکن ہجرت کے بعد کی مواخات کا مقصد تو افراد و اشخاص متعلقہ کو حقیقی اور نسبی بھائیوں جیسا بنانا تھا چنانچہ ان میں توارث بھی ہوتا تھا۔ آیت ذیل میں یہی حکم بیان کیا گیا ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (انفال)	بے شبہ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے ان لوگوں کو ٹھکانہ دیا اور مدد کی، یہ سب آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں،

حضرت عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے اور یہی جمہور علماء و مفسرین کی رائے ہے کہ اس

آیت کے نزول کے بعد توارث کا دارو مدار ہجرت پر تھا۔ لیکن اس کے بعد جب

اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ (انفال) ارباب قرابت نسبی ایک دوسرے کے (مال میں) زیادہ حقدار ہیں

نازل ہوئی تو وراثت کا مبنیٰ نسبی تعلق ہو گیا۔

اس مواخات کی عملی شکل یہ ہوئی کہ ایک روز نوّے صحابہ حضرت انس بن مالک کے گھر میں جمع تھے ان میں مہاجرین اور انصار نصف نصف تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے انصار کو مخاطب کر کے مہاجرین کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: یہ سب تمھارے بھائی ہیں۔ اس کے بعد ایک ایک انصاری اور ایک ایک مہاجر کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر فرماتے گئے کہ یہ اس کا بھائی ہے، لیکن یہ مواخات انھیں نوّے حضرات کے درمیان محدود نہ تھی جو اس وقت یہاں موجود تھے۔ بلکہ جو سرے سے مدینہ میں ہی موجود نہ تھے جیسے حضرت جعفر بن ابی طالب جو اس وقت حبشہ میں تھے حضور نے اُن کے اور ایک انصاری کے درمیان بھی مواخات کرائی۔ چنانچہ ابن ہشام نے جو نام گنائے ہیں ابن عبد البر نے اُن پر پندرہ حضرات کے ناموں کا اور اضافہ کیا ہے اور یہ تعداد ایک سو بیس تک پہنچ گئی ہے۔

انصار و مہاجرین کا ردِّ عمل اس مواخات کے زیر اثر انصار نے جس اخوت و محبت، فیاضی اور ایثار کا اور مہاجرین نے جس احسان شناسی، خود اعتمادی اور عزم و ہمت کا مظاہرہ کیا ہے وہ تاریخ میں پناہ گزینوں اور آباد کاروں کے لئے ہمیشہ آئینۂ عبرت اور سرمایۂ بصیرت بنا رہے گا۔ انصار کا حال یہ تھا کہ جوں ہی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ہاتھ مہاجرین کے ہاتھ میں دیا۔ انصار مہاجرین کو گھر لے گئے اور ایک ایک چیز دکھا کر بولے کہ آدھی ہماری ہے اور آدھی تمھاری۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی مواخات حضرت سعد بن الربیع سے ہوئی تھی۔ یہ حضرت عبد الرحمٰن کو لے کر گھر آئے اور بولے۔ میں اپنی ہر مملوکہ چیز میں نصف کا

مالک آپ کو بناتا ہوں یہاں تک کہ میری دو بیویاں ہیں، اُن میں سے ایک کو طلاق دیتا ہوں۔ تاکہ عدت گذرنے کے بعد آپ اُس سے نکاح کر سکیں، لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ آپ کے اہل و مال میں برکت عطا فرماتے، یہ سب چیزیں آپ کو مبارک ہوں، مجھے تو آپ بازار کا راستہ بتا دیجئے، جب انھیں بازار کا راستہ معلوم ہوگیا تو انھوں نے تجارت شروع کردی اور اُس میں نفع ہوا[1]۔

انصار کے غیر معمولی حسن سلوک کا مہاجرین پر یہ اثر تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: "یارسول اللہ! ہم نے انصار سے بڑھ کر شریف اور فیاض کوئی قوم نہیں دیکھی ہم کو اندیشہ ہے کہ کہیں ہمارا ثواب بھی انھیں کو نہ مل جائے۔" آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! ایسا نہیں ہوگا! تم لوگ جو انصار کے احسان و کرم کا شکریہ اور اُن کے لئے دعائیں کرتے ہو، بس تمھاری طرف سے یہی اُن کے احسان کا بدلہ ہے[2]۔

یہ سلوک تو انصار کا تھا، مہاجرین کا معاملہ یہ تھا کہ ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہ انصار پر بوجھ بن کر رہیں۔ انصار کھیتی باڑی کا مشغلہ رکھتے تھے، انھوں نے چاہا کہ اپنی زمینوں کو نصفا نصفی تقسیم کرلیں، لیکن چوں کہ مہاجرین اس فن سے ناواقف تھے اس بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مہاجرین کی طرف سے اس کی معذرت فرمائی اور پیداوار میں شرکت کی قرارداد ہوگئی، لیکن مہاجرین نے اس پر قناعت نہ کی۔ یہ تجارت پیشہ لوگ تھے، انھوں نے مدینہ میں بھی اسے شروع کردیا۔ اور اُس میں خوب ترقی کی۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی تجارت کے فروغ کا یہ عالم تھا کہ اُن کا سامانِ تجارت سات سات سو اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جس روز یہ کارواں مدینہ میں داخل ہوتا شہر میں غلغلہ برپا ہوجاتا تھا[3]۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب المناقب باب اخاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم و مسند امام احمد ساعاتی اڈیشن ج ۲۱ ص ۷

[2] مسند امام احمد ج ۲۱ ص ۱۰۔

[3] مسند امام احمد ج ۲۲ ص ۲۷۸

ایک مرتبہ انھوں نے اپنی ایک جائداد چالیس ہزار دینار میں حضرت عثمان کے ہاتھ فروخت کی اور اس میں ایک حصّہ انھوں نے امہات المومنین کا بھی رکھا، جب حضرت عائشہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ان کو دعا دی اور فرمایا: اے اللہ! عبدالرحمٰن بن عوف کو جنّت کی نہر سلسبیل کا پانی پلا ساتھ ہی ان کو یہ خوشخبری بھی سنائی کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے، ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: "میرے بعد تم سب (ازواج مطہرات) بی بیوں کی خبرگیری وہی لوگ کریں گے جو سچے اور نیک عمل ہوں گے"

(مسند امام احمد ج ۲۲ ص ۲۷۸)

اسی طرح حضرت ابوبکر نے مدینہ کے نواح کے ایک مقام سنح میں اپنی ایک فیکٹری قائم کی تھی۔ حضرت عثمان بنو قینقاع کے مشہور تجارتی بازار میں کاروبار کرتے تھے۔ اور اس میں وہ ترقی کی کہ غنی اُن کے نام کا جزء ہو گیا، علاوہ ازیں حضرت عمر بن الخطاب، حضرت زید بن حارثہ اور بعض اور مہاجرین کی نسبت طبقات ابن سعد اور اسد الغابہ اور صحیح بخاری کی کتاب البیوع سے تجارت اور کاروبار کرنے کا ثبوت ملتا ہے، انصار کا پیشہ اگرچہ فلاحت وزراعت تھا۔ اور اس کی وجہ سے ان میں بھی بڑے بڑے رئیس اور دولتمند تھے۔ لیکن مہاجرین کے دیکھا دیکھی ان میں بھی کاروبار کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت ابوہریرہ پر بعض حضرات کو یہ اعتراض تھا کہ وہ روایات کثرت سے کرتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ کو جب اس کا علم ہوا تو فرمایا: "لوگ" بازار میں کاروبار کرتے تھے اور میں شب و روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتا تھا۔

کوتاہ نظر سمجھتے ہیں کہ مدینہ میں آنے کے بعد غزوات اور سرایا کا جو سلسلہ شروع ہوا اُس کا ایک محرک مال غنیمت کا لالچ بھی تھا، لیکن ابھی جو کچھ عرض کیا گیا اُس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے، جو قوم خود محنت مزدوری کر کے اپنی معاش پیدا کرنے کا جذبہ رکھتی ہو اور اُس میں خود کفالتی ہو اُسے کیا پڑی ہے کہ لوٹ مار کر کے اپنی روزی حاصل کرنے کا سامان

رے، مالِ غنیمت کا حصول جنگ کا نتیجہ تو ہو سکتا ہے، ان لوگوں کے لئے اس کا مقصد ہرگز نہیں ہو سکتا، اور پھر اسلام کی تعلیم بھی یہی تھی، ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا: بہترین ذریعۂ معاش کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: "الکسب بالید" محنت مزدوری کر کے اپنی معاش پیدا کرنا۔ (البلاغ المبین لحافظ ابن حجر کتاب التجارۃ)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر سیاسی مسائل | اب جب کہ مہاجرین کی آبادکاری ہو گئی اور وہ سب اپنے اپنے ٹھکانے لگ گئے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہم اور بنیادی امور و مسائل کی طرف توجہ مبذول فرمائی۔ اصولی طور پر یہ معاملات دو قسم کے تھے:-

(۱) داخلی اور اندرونی تحفظ: (Internal Security)

(۲) خارجی اور بیرونی تحفظات:- (External and Territorial Security)

ظاہر ہے سیاسی اعتبار سے آپ کے سامنے سب سے بڑا مرحلہ کفارِ قریش سے نمٹنے کا تھا، لیکن جب تک اندرونی معاملات میں اطمینان اور داخلی تحفظات نہ ہوں بیرونی دشمنوں سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں، اس بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے داخلی امن و تحفظات پر توجہ فرمائی، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ خطرہ اور اندیشہ مدینہ سوسائٹی کے دو طبقوں سے ہو سکتا تھا: (۱) ایک منافقین جن کو سیاسی اصطلاح میں کالی بھیڑ (Black Sheep) کہہ سکتے ہیں اور (۲) دوسرے یہود جن کی فطرت کو تاریخی تسلسل نے غداری، جعل و فریب اور فتنہ پردازی کے سانچہ میں ڈھال دیا تھا۔ مدینہ میں یہ دونوں طبقے مسلمانوں کے لئے سخت خطرناک بھی تھے اور وہاں کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں ان کا عمل دخل اور اثر بھی بہت زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جس کثرت سے ان دونوں طبقوں اور اُن کی دسیسہ کاریوں . . . .

. . . .

کا مذکرہ ہے (کفارِ مکہ کے علاوہ) کسی اسلام دشمن جماعت یا گروہ کا اس کثرت سے نہیں کیا ان میں سے ایک طبقہ مارِ آستین تھا اور دوسرا گرگِ بارانِ دیدہ، اب آئیے، یہ دیکھیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا :۔

المنافقون | یہ وہ لوگ تھے جو زبان سے اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کرتے، لیکن در حقیقت اُن کو اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ اور اس لئے پوشیدہ طور پر وہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور اُن کے ساتھ استہزا اور تمسخر کا معاملہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے، بنو عبد الاشہل کا قبیلہ تو ایسا تھا کہ اُس میں نہ کوئی مرد منافق تھا اور نہ کوئی عورت! اس کے علاوہ اوس اور خزرج اور اُن کے ماتحت چھوٹے چھوٹے قبیلے مثلاً بنی عمرو بن عوف، بنی اُمیّہ بن زید، بنو حارثہ، بنو النجار، اور یہود ان سب میں تھوڑے بہت منافق تھے، ان سب کا سردار عبداللہ بن اُبَی بن سلول تھا یہ بنی عوف بن الخزرج سے تعلق رکھتا تھا، یہی وہ شخص ہے جس نے غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر کہا تھا کہ " مدینہ واپس لوٹ کر ہم مسلمانوں کو مدینہ سے نکال باہر کریں گے "۔ اسی پر قرآن مجید کی سورۃ المنافقون نازل ہوئی جس میں ان لوگوں کی دسیسہ کاریوں کا پردہ چاک کیا گیا اور اس شخص کے خاص مذکورۂ بالا فقرہ کا اس آیت میں جواب دیا گیا ہے:

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ط وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝	یہ منافق کہتے ہیں کہ ہم مدینہ پہنچے نہیں کہ عزت والا وہاں سے ذلیل کو نکال دے گا، حالانکہ اصل عزت تو اللہ، اُس کے رسول اور مومنوں کی ہے۔ لیکن منافق نہیں جانتے۔

اسی سورۃ کی ایک اور آیت میں فرمایا گیا :

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۔ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ	یہی وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس ہیں اُن پر خرچ نہ کرو، یہاں تک کہ وہ تتر بتر ہو جائیں حالانکہ آسمانوں اور

الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں۔ لیکن منافق نہیں سمجھتے،

ان تمام باتوں کے باوجود یہ لوگ کسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آکر بیٹھتے، سراپا گوش اور ہمہ تن خشوع و خضوع بن کر ارشادات گرامی کو سنتے، اور حضور بھی ان کے بہروپیے پن کی وجہ سے جب یہ کوئی بات کہتے تو توجہ سے سنتے تھے، قرآن نے اس پوری سرگذشت کو نہایت بلیغ پیرایہ میں بیان کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ

اور اے محمد جب آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں تو ان کے ڈیل ڈول آپ کی نظروں میں کھپ جاتے ہیں اور (اسی وجہ سے) وہ کوئی بات کہتے ہیں تو آپ اس پر کان دھرتے ہیں، یہ (بیٹھتے ہیں تو اس ادب و احترام کے ساتھ) گویا بے حس و حرکت ٹیک لگی لکڑی ہیں اور (ان کی نمائشی خشیت کا یہ عالم ہے) کوئی سی ہی چیخ ہو، یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا نشانہ وہی ہیں۔

اب اللہ تعالیٰ ان کے مکر و فریب اور دورخی کا پردہ چاک کرتا اور حضور کو ان سے ہشیار رہنے کا حکم کرتا ہے:

هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝

(اے محمد) یہ لوگ آپ کے دشمن ہیں اس لئے آپ ان سے ہوشیار رہیں ان لوگوں پر خدا کی مار، یہ بہکے بہکے کدھر جا رہے ہیں،

اللہ تعالیٰ کی اس تنبیہ اور اعلان کے مطابق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے متعلق جو رویہ اختیار فرمایا وہ یہ تھا کہ

(۱) آپ ہمیشہ ان کی طرف سے چوکنے اور ہوشیار رہتے۔ ان کے اعمال و افعال پر کڑی نظر رکھتے اور اُن کے حرکات و سکنات کی نگرانی کرتے تھے۔

(۲) اسلام یا مسلمانوں کی نسبت یہ لوگ جو بیہودہ باتیں کہتے رہتے تھے، نام لیے بغیر قرآن ان کی تردید کرتا رہتا تھا۔

(۳) لیکن بظاہر عجیب بات یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی کسی منافق کو قتل کیا نہ جلا وطن کیا اور نہ کبھی کوئی سزا دی، یہ سب کچھ تو درکنار! آپ نے ان لوگوں کے جنازہ کی نماز پڑھی اور اُن کے لئے استغفار کی ہے، پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پر ٹوکا اور یہاں تک جتا دیا کہ اگر آپ ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے تو اللہ تب بھی ان منافقوں کی مغفرت ہرگز نہیں کرے گا" تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے رُک گئے۔

ہمارے مفسرین اور مورخین منافقوں کے ساتھ حضور کے اس معاملہ اور برتاؤ پر سرسری طور پر گذر گئے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے جس سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے رک گئے۔

ہمارے مفسرین اور مورخین منافقوں کے ساتھ حضور کے اس معاملہ اور برتاؤ پر سرسری طور پر گذر گئے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے جس سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالِ تدبر و سیاست اور غیر معمولی حلم و فراست کا ثبوت ملتا ہے ہمارے نزدیک اس کے وجوہ و اسباب حسب ذیل تھے:۔

(۱) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منظور کلمہ کی لاج رکھنا تھا۔ ان لوگوں کے دلوں میں اسلام اور حضور کی نسبت کیسا ہی کینہ کپٹ ہو بہرحال زبان سے یہ کلمہ پڑھتے اور مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے حضور کو یا آپ کے ہر وقت کے ساتھیوں اور محرمانِ راز کو تو معلوم تھا کہ قرآن جن لوگوں کو بار بار منافق کہہ رہا اور اُن کے شر سے آگاہ کر رہا ہے اُس کا مصداق کون ہیں۔ لیکن عام مسلمانوں اور غیر مسلموں کو اس کا علم نہیں تھا۔ اس بنا پر

حضور کو خیال ہوا کہ اگر آپ نے ان لوگوں کے ساتھ تشدد کا معاملہ کیا تو اس سے ناواقف مسلمانوں میں بددلی پیدا ہوگی اور غیر مسلموں کو زبانِ طعن دراز کرنے کا موقع ملے گا، چنانچہ ایک روایت میں حضور نے اس خیال کا اظہار فرمایا بھی ہے۔

(۲) رحمت عالم کی افتادِ طبع اور مزاج ہی کچھ ایسا تھا کہ جس نے جھوٹ موٹ کو بھی کلمہ پڑھ لیا آپ اُس کے ساتھ وسعتِ قلب اور مدارات و رواداری کا معاملہ کرتے تھے۔ چنانچہ مولفۃ القلوب اور اعراب مدینہ جن کے متعلق قرآن میں قالت الاعراب آمنا، قل لم تومنوا ..... الآیۃ فرمایا گیا ہے ان کے ساتھ بھی حضور نے تسامح اور اغماض و چشم پوشی کا یہی معاملہ کیا اور اسی بناپر ایک موقع پر آپ نے "ھلا شققت قلبہ" تو پھر تو نے اُس کا دل چیر کر کیوں نہیں دیکھ لیا، فرمایا

(۳) منافقوں کی انصار سے قرابت اور رشتہ داریاں تھیں، آپ نے خیال فرمایا کہ اگران کو سزائیں (جلاوطنی یا قتل) دی گئیں تو طبعی طور پر انصار کو اس کا ملال اور رنج ہوگا۔

(۴) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو توقع تھی کہ اسلام کی طاقت و قوت میں جوں جوں اضافہ ہوگا اور منافقوں کو آپ کی صحبت میں بیٹھنے اور مسلمانوں سے ملنے جلنے کے مواقع جتنے زیادہ ملیں گے اسی قدر ان لوگوں کی اصلاح ہوتی رہے گی۔ چنانچہ ایسا ہوا بھی، اسلام کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس جماعت میں کمی ہوتی رہی۔ (باقی)

گذارش

خریداری برہان یا ندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلہ میں خط و کتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر برہان کی چٹ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر نہ ہو ———— ادارہ کے قواعد و ضوابط مفت طلب فرمائیے۔

عہدِ نبویؐ کے
غزوات و سرایا اور ان کے ماخذ پر ایک نظر

(۴)

سعید احمد اکبرآبادی

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو برہان ماہ اگست ۷۴ء

یہودِ مدینہ

اب رہے یہود! ان کے متعلق یہ بات تو یقینی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ پہونچے ہیں تو اس وقت، خاص مدینہ اور اس کے قرب وجوار میں یہود کے چھوٹے بڑے متعدد قبیلے آباد تھے، لیکن یہ لوگ کون تھے؟ وہیں کے اصل باشندے تھے یا کہیں سے ہجرت کر کے آئے تھے؟ مسلمان محققین اور مستشرقین دونوں نے اس موضوع پر دادِ تحقیق دی ہے لیکن جو کچھ ہے قیاسات اور اندازے ہیں۔ قطعی بات کوئی نہیں کہہ سکا ہے لیکن ہمارے موضوع سے اس تحقیق کا کوئی تعلق نہیں، اس لئے ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ یہ بات مسلّم ہے کہ یہ یہود دو قسم کے تھے ایک وہ جو پہلے فلسطین اور شام میں آباد تھے لیکن جب وہاں رومن شہنشاہیت عیسائی مذہب کے زیرِ اثر آگئی اور یہود نے اس کے خلاف سازشیں کیں اور بغاوت کرنی چاہی تو ان کو وہاں سے جلاوطن کر دیا گیا اور اب انہوں نے یثرب، تیما اور خیبر میں پناہ لی اور یہاں اپنی آبادیاں قائم کر لیں دوسری قسم ان یہود کی تھی جو عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے اور یہیں کے اصل باشندہ تھے۔ لیکن انہوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا، سمہودی کا بیان ہے کہ اس علاقہ میں جو یہود آباد تھے وہ مختلف قلعوں اور آبادیوں[1] میں بستے تھے۔ ان قبیلوں کی تعداد بیس کے لگ بھگ

---

[1] اس موقع پر عربی الفاظ "حصون و آکام" ہیں۔ حصون کے معنی تو قلعے ہیں، "آکام" کا انگریزی ترجمہ انگریزی میں [illegible] ہوگا۔ اردو میں اس کا ترجمہ "آبادی یا بستی" ہونا چاہیے۔

تھی، ان میں مشہور قبیلوں کے نام یہ ہیں: بنو النضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع، بنو بہدل، بنو عکرمہ، بنو ثعلبہ، بنو محمر، بنو زعورا، بنو زید، بنو عوف اور بنو القصیص اور خالص عرب نسل کے جو قبیلے ان لوگوں کے ساتھ خلا ملا اور ربط و ضبط رکھتے تھے ان کے نام یہ ہیں: بنو الحرمان ریمین کا قبیلہ ہے، بنو مرثد یہ بلی کی شاخ ہے، بنو نیف، یہ بھی قبیلۂ بلی کی شاخ ہے، بنو معاویہ، بنو الحارث، بنو الشطیبہ، یہ قبیلۂ غسان کی شاخ ہے۔[1]

آہنگری، زرگری اور تجارت یہود کے خاص پیشے اور مشغلے تھے آہنگری کے سلسلہ میں یہ لوگ آلاتِ زراعت، اسلحہ یعنی زرہیں اور تلواریں بناتے تھے۔ زرگری کی نسبت سے سونے چاندی کے زیورات بناتے اور تجارت کے سلسلہ میں غلہ اور اناج کی تجارت کرتے اور اپنے قافلے شام اور حجاز بھیجتے رہتے تھے، عرب قبائل کا ذریعہ معاش جو کچھ تھا کھیتی باڑی کا کام تھا، وہ یہود کے ذرائع معاش سے نفور اور دور تھے۔ اسی کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ یہود بیحد مالدار تھے اور عرب قبائل غریب تھے، سودی لین دین کرنا یہود کی فطرت ہے چنانچہ یہ لوگ سود پر اپنا روپیہ عرب قبائل کو دیتے تھے اور جیسا کہ قاعدہ ہے اس بنا پر عرب قبائل ہمیشہ ان کے مقروض اور دست نگر رہتے تھے، قرآن مجید میں یہود کی اس صفت کا تذکرہ بہ صورت وعید آیا ہے۔

علاوہ ازیں یہ لوگ اہل کتاب تھے، دین کے مبادی اور اصول موضوعہ سے واقف تھے اور توراۃ پڑھتے پڑھاتے تھے، اس مقصد کے لئے ان کے اپنے مدارس تھے جن کو عہد جاہلیت میں "المدارس" "بیت المدارس" اور "المدرش"[2] کہا جاتا تھا، ان میں توراۃ، تلمود، مشنا، زبان، ادب، اخبار و قصص وغیرہ کی باقاعدہ تعلیم ہوتی تھی اور جس کو مسلمان اپنی اصطلاح میں عالم کہتے ہیں۔ یہود اس کو "درشن" کہتے تھے، قرآن مجید میں علماء یہود کے لئے دو لفظ آئے ہیں، ایک احبار اور دوسرا ربانیون، علمائے لغت کے مطابق ان دونوں

---

[1] خلاصۃ الوفاء باخبار دار المصطفیٰ ص ۸۰ ۔ [2] عبرانی لفظ ہے درش سے مشتق عربی کے درس کے ہم معنی

لفظوں کی اصل بھی عبرانی ہے۔ پہلا لفظ "حَبرُ" تھا اور اس کی جمع حبریم آتی تھی اور دوسرا لفظ "ربن" (RIBBON) کی عربی شکل ہے۔[1]

بہرحال یہ لوگ لکھے پڑھے اور ارباب علم و فضل تھے اور ان کی اس حیثیت کو قرآن مجید نے بھی تسلیم کیا ہے، لیکن ان کی اصل فطرت یہاں بھی بروئے کار آئی یعنی یہ اپنے پر اس درجہ گھمنڈ کرنے لگے کہ اپنے سوا کسی کو نظر میں نہیں لاتے اور دوسروں کی تحقیر و تذلیل کرتے تھے چنانچہ عرب قبائل کو از راہِ استخفاف و استحقار "امیون" کہتے تھے جن کے معنی ان کے نزدیک "ان پڑھ" اور "بے کتاب" تھے، اسی لئے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اثبات و اظہار کے لئے فرمایا۔

ھوالذی بعث فی الامیین	یہ وہی خدا ہے جس نے امیوں میں (جو کچھ
رسولاً منھم یتلوعلیھم	نہیں جانتے تھے اور اس بنا پر یہود ان کا
آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم	مذاق اڑاتے اور ان کی تحقیر کرتے تھے)،
الکتٰب والحکمۃ، وان	انہیں میں سے ایک ایسا رسول پیدا کر دیا جو
کانوا من قبل لفی ضلالٍ	ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا، ان کا تزکیہ نفس
مّبین۔	کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے،
	اگرچہ یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

ان "امیون" کی ان لوگوں کی نگاہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی، اور نہ ان کے ساتھ کسی قسم کا معاملہ کرنے میں کسی اخلاقی ضابطہ اور قاعدہ و قانون کی پابندی ضروری تھی، وہ کہتے اپنا حق سمجھتے تھے کہ جو چاہیں کریں، آیت ذیل میں اللہ تعالیٰ نے امیوں کے ساتھ یہودیوں کی اس بدمعاملگی کو ہی بیان فرمایا ہے۔

ومنھم من ان تامنہ بدینارٍ   اور یہود میں بعض لوگ ایسے ہیں کہ اگر تم ان

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ العرب قبل الاسلام جواد علی ج ۶ ص ۱۴ تا ۱۱۵۔

لا يؤده اليك الا مادمت عليه قائما ذالك بانهم قالوا ليس علينا في الاميين سبيل ويقولون على الله الكذب وهو يعلمون ہ	کے پاس ایک اشرفی بطور امانت رکھو تو وہ تم کو تمہاری امانت اس وقت تک واپس نہیں دیں گے جبتک تم ہر وقت ان کے سر پر کھڑے نہ ہو۔ ان کا یہ رویہ اس لئے ہے کہ وہ کہتے ہیں امیوں کا ہم پر کوئی حق نہیں ہے اور ہمیں کھلی چھوٹ ہے کہ ان کے ساتھ جو معاملہ چاہیں کریں۔ یہ لوگ جان بوجھ کر اللہ پر طوفان جوڑتے ہیں۔
(آل عمران)	

جیسا کہ گذر چکا ہے یہ کہنا تو مشکل ہے کہ فلسطین اور شام سے اجڑ کر یہ لوگ یثرب میں کب آکر آباد ہونا شروع ہوئے البتہ یہ یقینی ہے کہ جب اوس اور خزرج جنوب کی طرف سے ہجرت کر کے یہاں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ اس پر یہود کا غلبہ ہے، ان کے دوش بدوش بعض عرب قبائل رہتے تھے لیکن یہ ان سے کمزور تھے۔ چنانچہ تیرہ بستیاں (آطام) عربوں کی تھیں تو انسٹھ (۵۹) آبادیاں یہود کی تھیں۔ عرب قبائل ان کے جوار (حفاظت) میں رہتے تھے یا ان کے حلیف تھے۔

عربوں کے ساتھ ان لوگوں کا تحقیر و تذلیل کا معاملہ یہاں تک تھا کہ یہودیوں کے قبیلہ بنو ثعلبہ کے فطیان نامی ایک سردار نے قبیلہ خزرج کی شاخ بنو عوف پر یہ پابندی لگائی تھی کہ جب ان کی کسی لڑکی سے شادی ہوگی تو دلہن پہلی شب ان کے ساتھ بسر کریگی۔ اس رسم بد کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ ایک مرتبہ جب مالک بن عجلان کی بہن کا نکاح ہوا اور اس نے اس رسم کے خلاف سخت احتجاج کیا اور مردوں کو ان کی بے غیرتی اور بے حمیتی پر سخت عار اور شرم دلائی تو مالک بن عجلان نے فطیان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور اپنے قبیلے کو اس مصیبت عظمیٰ سے نجات دلائی۔

اوس اور خزرج چونکہ یہودیوں کی غیر مزروعہ زمینوں پر آباد ہوئے تھے، اس بنا پر اول اول ان کی حیثیت یہودیوں کے باج گذار اور ان کے ماتحت کی تھی لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ان کی طاقت وقوت میں اضافہ ہوتا رہا چنانچہ ہجرت نبوی کے وقت یثرب کی زمام اقتدار اوس[۱] اور خزرج کے ہاتھوں میں آچکی تھی اور اب وہ یہود کی رعایا نہیں بلکہ ان کے حریف اور مدمقابل تھے۔

تاہم یثرب کی سوسائٹی میں یہود ایک مستقل حیثیت کے مالک تھے، یہ صاحب رسوخ و اثر تھے اور تجارت اور اہل کتاب ہونے کے رشتہ سے حجاز اور شام و فلسطین کے لوگوں سے بھی ان کے تعلقات اور مراسم تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہونچنے سے قبل اپنے بعض نمائندے یہود مدینہ کے پاس بھی بھیجے تھے اور ان کو دعوت اسلام دی تھی[۲] اس دعوت کا اثر اکّے دُکّے چند اشخاص پر ضرور ہوا لیکن مجموعی طور پر انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسلام کی مخالفت اور دشمنی میں ان کا رویہ روز بروز سخت اور نہایت معاندانہ ہوتا رہا۔ پھر تاریخ نے غداری اور خیانت کے جس سانچہ میں ان کی فطرت کو ڈھالا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بے خبر نہیں ہوسکتے تھے، اس بنا پر تدبر، سیاست اور دور اندیشی، ان میں سے ہر ایک کا تقاضا تھا کہ قریش مکہ کی طرف متوجہ ہونے سے قبل یہود کے ساتھ کوئی معاملہ کر لیا جائے۔

دوسرے قبائل

پھر صرف ایک یہود کا معاملہ ہی تو نہ تھا، مکہ سے لے کر ایران اور شام کی سرحد تک پچاسوں قبیلے آباد تھے، ان میں وہ بھی تھے جن کے قریش مکہ

---

[۱] MUHAMMAD IN MEDINA : WATT. MONTGOMERY, P.192/193

[۲] علاوہ ازیں پورا قرآن اہل کتاب کے تذکرہ اور ان کے پیغمبروں اور کتابوں کی تعریف سے بھرپور ہے جس سے قرآن کا ہر طالب علم باخبر ہے ہی۔

سے براہ راست تعلقات تھے، بعض قبیلے ایرانی اور رومی حکومتوں کے زیر اثر یا ان کے باجگذار تھے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو نظرانداز نہیں کر سکتے تھے ان قبائل کے نام یہ ہیں :۔

مکہ اور مدینہ کے مغرب میں آباد قبائل

(۱) خزاعہ (اسلم، کعب، عمرو اور المصطلق کے ساتھ)

(۲) کنانہ : بکر بن عبد مناۃ

(۳) ضمرہ : (غفار کے ساتھ) لیث، الدیل، مدلج، الحارث بن مناۃ (الاحابیش کا ایک جزء)

(۴) مزینہ

(۵) جہینہ

(۶) عبد شمس (دوس کے ساتھ)

مکہ اور مدینہ کے مشرق میں آباد قبائل

(۱) خزیمہ (بن مدرکہ) اس کی ایک شاخ کنانہ ہے۔

(۲) اسد بن خزیمہ (عضل، القارہ، غزوۂ خندق کے موقعہ پر اس قبیلہ نے کفار قریش کی مدد کی تھی۔

(۳) طے (نبہان کے ساتھ)

(۴) ہذیل بن مدرکہ

(۵) لحیان

(۶) محارب بن خصفہ

(۷) غطفان

(۸) اشجع ـــــ غزوۂ خندق کے موقعہ پر کفار قریش کی مدد کی تھی۔

(۹) فزارہ " " "

(۱۰) مرۃ ——— غزوۂ خندق کے موقعہ پر کفار قریش کی مدد کی تھی

(۱۱) ثعلبہ۔

(۱۲) ہوازن: یہ قبیلہ بھی اسلام کا سخت دشمن تھا۔

(۱۳) عامر بن صعصاع: البکاع، ہلال، کلاب، ربیعہ،

(۱۴) جشم: نصر، سعد بن بکر، ثمالہ،

(۱۵) ثقیف (بن مالک یعنی احلاف) اور باہلہ

وہ قبائل جو مدینہ کے شمال میں آباد تھے

(۱) سعد ہذیم، عذرہ

(۲) جذام

(۳) قضاعہ (جرم، القین اور سلمان کے ساتھ)

(۴) بالی۔

(۵) بہرا۔

(۶) لخم (دار کے ساتھ)

(۷) غسان۔

(۸) کلب۔

جو قبائل مکہ کے جنوب میں آباد تھے

(۱) خثعم (ان کے قریب ہی ازدشنوء آباد تھے)

(۲) مذحج۔

(۳) النخع، جعفی، خولان، التجاع، رہاء، سعد العشیرۃ (زبید کے ساتھ) سودا

(۴) بجیلۃ۔

(۵) ہمدان۔

(۶) الحارث بن کعب (ہند کے ساتھ)
(۷) مراد۔
(۸) کندہ (تجیب کے ساتھ)

وہ قبائل جو عرب کے دوسرے حصوں میں آباد تھے

(۱) مہرہ۔
(۲) ازد (عمان) عبدالقیس (بحرین میں)
(۳) حنیفہ۔
(۴) تمیم۔
(۵) وائل۔
(۶) بکر (شیبان کیساتھ) تغلب [1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منصوبۂ امن و جنگ

اب غور کرنا چاہیئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مکہ میں بیچارگی و بے بسی اور مظلومیت کے تیرہ برس گذارنے کے بعد ابھی مدینہ آئے ہیں اور آپ کے متبعین کی تعداد چند سو سے بھی متجاوز نہیں ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود سیاسی اعتبار سے کتنے اور کیسے اہم اور صبر آزما مراحل ہیں جن سے آپ کو عہدہ برآ ہونا ہے۔ پھر جس عظیم کامیابی اور فتحمندی کے ساتھ آپ ان تمام منزلوں سے گذر گئے ہیں وہ بے شبہ اعلیٰ قسم کے تدبر اور سیاسی حزم و دور اندیشی کا نہایت حیرت انگیز شاہکار ہے

اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین محاذ تھے۔

(۱) سب سے بڑا محاذ تو قریش مکہ ہی کا تھا۔ ان کے ساتھ جنگ کے نہ صرف جواز بلکہ

---

[1] ان قبائل کے شجرہائے نسب اور ان کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے (۱) تاریخ العرب قبل الاسلام ڈاکٹر جواد علی جلد ۵، ۱۶۵ اور (۲) MOHAMMAD IN MEDINA W. MONTGOMERY WATT باب ۴

وجوب کے لئے وہ معاملہ ہی کافی تھا جو انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمان مردوں اور عورتوں کے ساتھ کیا تھا۔ اس پر مزید یہ ہوا کہ ہجرت نے ان کی آتش غیض وغضب پر جلتی پر تیل کا کام کیا تھا، اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہے، جیسا کہ بیعت عقبۂ ثالثہ اور اس کے نتیجہ میں پوشیدہ طور پر مسلمانوں کے مدینہ پہونچ جانے کا علم ہونے پر قریش کے بعض سرداروں نے کہا بھی تھا۔ انہیں اس کا یقین تھا کہ اگر مسلمانوں کے قدم مدینہ میں جم گئے تو وہ ان لوگوں کی تجارتی لائن کو کاٹ دیں گے اور شام کی آمد ورفت روک دیں گے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ اندیشہ بے اصل تھا بھی نہیں۔ کیونکہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے تو ہجرت کی بھی اسی منصوبہ اور پلان کو ذہن میں رکھتے ہوئے۔ اور آپ کے علاوہ مسلمان بھی عام طور پر اس سے خالی الزہن نہیں تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ ہجرت کے بعد ہی سعد بن معاذ جو انصار میں ایک بڑی حیثیت کے شخص تھے، عمرہ کے ارادہ سے مکہ گئے اور دیرینہ تعلق کے باعث امیہ بن خلف کے مہمان ہوئے۔ انہوں نے امیہ سے اپنے ارادے کا ذکر کیا تو ایک روز دوپہر کے وقت امیہ ان کو لیکر نکلا۔ اتفاق سے راستے میں ابوجہل مل گیا۔ ابوجہل کو جب معلوم ہوا کہ یہ سعد بن معاذ ہیں تو اس نے بگڑ کر ان سے کہا۔ "تم لوگوں (انصار مدینہ) نے سرپھروں (صابیوں) یعنی مسلمانوں کو مدینہ میں پناہ دی ہے اور یہاں تم اطمینان سے طواف کر رہے ہو۔ یہ میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ خدا کی قسم! اگر تم امیہ کی پناہ میں نہ ہوتے تو مدینہ واپس نہیں جا سکتے تھے" حضرت سعد بن معاذ نے گرج کر جواب دیا۔ خدا کی قسم! اگر تم لوگوں نے ہمارا کعبہ کا آنا جانا روکا تو ہم تم لوگوں کی شام کی آمد ورفت (تجارت کے لئے) روک دیں گے اور یہ تمہارے لئے سب سے بڑا حادثہ ہوگا۔[1]

---

[1] باب ذکر النبی من یقتل ببدر

بہرحال ایک یہ اندیشہ جوان کے لئے درحقیقت زندگی اور موت کا سوال تھا اور دوسری طرف اسلام کا ایک عظیم الشان انقلابی تحریک کی حیثیت سے ترقی کرنا، یہ دو چیزیں تھیں جنہوں نے قریش کو اور زیادہ سراسیمہ اور چراغ پا کر دیا اور اب انہوں نے جو ایک طرف مدینہ کے سربرآوردہ لوگوں کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر اُکسایا اور دوسری جانب جو قبائل ان کے زیر اثر تھے ان کو اسلام سے باز رکھنے اور حضور کی خدمت میں حاضری سے روکنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ہجرت کے فوراً بعد ہی قریش نے عبداللہ بن ابی کو جو انصار میں اقتدار اعلیٰ رکھتا تھا ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔

انکم آویتم صاحبنا وانا نقسم	تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی
باللہ لتقاتلنہ او تخرجنہ	ہے ہم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اس سے
او لنسیرن الیکم باجمعنا	جنگ کرو یا اس کو وہاں سے نکال باہر کرو،
حتی نقتل مقاتلتکم ونستبیح	ورنہ ہم سب تم پر چڑھائی کردیں گے یہاں تک
نساء کم[1]	کہ تمہارے جنگ آزماؤں کو قتل کردیں
	اور تمہاری عورتوں کو اپنے لئے مباح بنالیں۔

قریش نے اسی مضمون کا ایک خط بنو قریظہ کو بھی لکھا تھا جس کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔ علاوہ ازیں قبیلے قبیلے ان کے کارندے گھومتے رہتے اور اسلام کے خلاف ان کو مشتعل کرتے رہتے تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس وقت سب سے بڑا محاذ قریش مکہ کا تھا اور آپ کے لئے ان سے جنگ کرنا ناگزیر تھا۔ لیکن جنگ کب شروع ہوگی اور اس کا طریقہ کیا ہوگا؟ اس کا اعلان واظہار کرنے سے پہلے

---

[1] سنن ابو داؤد۔ باب خبر النضیر۔

ضروری تھا کہ آپ دوسرے محاذوں کی طرف سے اطمینان حاصل کرلیں۔

دوسرا محاذ یہود کا اور تیسرا محاذ قبائل کا تھا۔ یہود کے چھوٹے بڑے اگرچہ بہت سے قبیلے تھے۔ لیکن ان میں بڑے اور اہم تین ہی قبیلے تھے۔ بنو النضیر، بنو قینقاع اور بنو قریظہ۔ اب رہے قبائل ان میں مندرجہ ذیل دو قسم کے قبیلے بہت اہم تھے

۱۔ ایک وہ جو سمندر کے کنارے کنارے مکہ اور مدینہ کے درمیانی مقامات میں آباد تھے، ظاہر ہے ان قبائل کو اپنے اعتماد میں لیے بغیر قریش سے جنگ کرنا چند در چند دشواریوں اور دقتوں کا باعث ہو سکتا تھا۔

۲۔ دوسرے وہ قبیلے جو مختلف بیرونی مملکتوں کے ساتھ حلیفانہ تعلق رکھنے کے باعث ان کے لئے بطور ایجنٹ کے تھے اور اس لئے حضورؐ کے واسطے وہ کبھی قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتے تھے۔ مثلاً قبیلہ غسان بازنطینی حکومت کا، لخم، ساسانی حکومت کا اور حمیر، سلطنت حبشہ کا حلیف اور دوست تھا اور ان تینوں حکومتوں کے جو عزائم اور ارادے عرب کے متعلق تھے، تاریخ عرب کا ہر طالب علم اس سے باخبر ہے۔

اسلام کی دعوت ایک دعوتِ عام تھی اور ہر شخص اس کا مخاطب تھا۔ جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول کرلیا وہ خود بخود اسلامی سماج کا جزء ہو گئے۔ لیکن جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا وہ دو قسموں میں منقسم تھے (الف) ایک وہ جو مسلمان نہ ہونے کے باوجود اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغض و عناد کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے اور (ب) دوسرے وہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے اور عملاً اس کا مظاہرہ کرتے بھی رہتے تھے۔

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے جزیرۃ العرب کی سیاسی صورت حال کو پیشِ نظر رکھ کر جو طویل المیعاد منصوبہ اور نقشہ ذہن میں بنایا اس کے خاص عناصر ترکیبیہ تھے۔

(۱) قریش سے جنگ کا آغاز ان کی تجارتی لائن پر (جو مکہ سے مدینہ ہوتی شام اور عراق کی طرف نکل جاتی ہے) قبضہ کرنے اور اس کو ان کے لیے غیر محفوظ بنا دینے سے کیا جائے۔

(۲) جو قبائل مکہ کے ارد گرد یا مکہ اور مدینہ کے درمیان آباد ہیں اور انھوں نے اسلام کے ساتھ دشمنی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا ہے ان کے ساتھ معاہدہ کیا جائے۔

(۳) مدینہ میں جو یہودی قبائل آباد ہیں ان میں اور مسلمانوں میں معاہدہ کرایا جائے۔

(۴) شام اور عراق کی سرحد پر رومی اور ایرانی سلطنتوں نے جن عرب قبائل کو اپنا باجگذار مطیع و فرماں بردار بنا رکھا ہے۔ اگر یہ سلطنتیں اسلام قبول نہ کریں تو ان عرب قبائل کو ان کے پنجۂ استبداد و ستم سے آزاد کرایا جائے۔

قبائل سے معاہدہ

اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا عملی اقدام یہ کیا کہ جو قبائل قریش کے ساتھ جنگ کے نقطۂ نظر سے جغرافیائی اعتبار سے نہایت اہم مقامات پر آباد تھے، آپ نے معاہدہ کے ذریعہ ان کو اپنا حلیف بنا لیا۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنی قابلِ قدر اور محققانہ عربی تالیف "مجموعۃ الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدہ" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

"اس کتاب کی جو فصل قبائل عرب کے لئے مخصوص ہے اس کے مطالعہ سے قاری کو معلوم ہوگا کہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا یہ تھا کہ مکہ کے ارد گرد جو قبائل آباد تھے ان کو مسلمان بنا کر ورنہ عہد و پیماں کے ذریعہ اپنا حامی بنا کر انہیں قریش سے الگ کر دیں۔ چنانچہ نبوت کے بعد آپ نے جو پہلا[1] سیاسی کارنامہ انجام دیا ہے وہ یہ ہے کہ ان قبائل سے معاہدہ کیا ہے جو مدینہ اور سمندر کے ساحل کے درمیان آباد تھے مثلاً جُہَیْنَہ، ضَمْرَہ اور غِفَارْ، ان

[1] ڈاکٹر صاحب نے قبائل سے معاہدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہجرت کے بعد سب سے پہلا سیاسی اقدام کہا ہے، ہمارے نزدیک یہ کہنا مطلقاً صحیح نہیں ہے مثلاً ضمرہ سے معاہدہ ہجرت کے دوسرے برس ماہ صفر میں ہوا ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے خلاف پروگرام کے مطابق اپنی کارروائی شروع کر دی ہے، درحقیقت واقعات اس طرح جا بجا گڈمڈ ہیں اور ہمارے مؤرخین سیرت و مغازی نے تاریخ لکھنے کا اہتمام نہیں کیا ہے کہ قطعیت کے ساتھ کسی تاریخ کا متعین کرنا دشوار ہے۔

قبائل کی آبادیاں انہی راستہ پر واقع تھیں جس پر سے قریش کو موسم گرما میں شام اور مصر کی طرف اپنا کاروانِ تجارت لے جانے میں گذرنا ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قریش کا یہ راستہ بند کردیا اور اس میں ان قبائل میں سے جو آپ کے حلیف تھے، انھوں نے آپکی مدد کی اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خزاعہ، اور اسلم وغیرہ ان قبائل سے معاہدہ کیا جو کہ اردگرد رہتے تھے۔"

علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب اپنی ایک اور کتاب "عہدِ نبوی کے میدان جنگ" میں لکھتے ہیں:۔

"ہجرت کے ساتھ ہی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آس پاس کے قبائل سے معاہدے حلیفی اور معاونت کے معاہدے کرنے شروع کر دیئے تھے، چنانچہ سنہ ۱ھ میں جہینہ کے بعض سرداروں سے معاہدہ ہوا تھا۔ سنہ ۲ھ میں ینبوع (مکہ اور مدینہ کے درمیان مشہور بندرگاہ) کے آس پاس بسنے والے بنو ضمرہ، بنو مدلج۔ بنو زرعہ اور بنو ربعہ سے دوستی اور اعانت یا غیر جانبداری کے معاہدے ہو گئے تھے۔ خوش قسمتی سے تاریخ نے ان معاہدوں کے متن کو محفوظ رکھا ہے اور ان معاہدوں کے ساتھ ہی قریش پر راستہ بند کیا جاسکا کیوں کہ یہ سب قبائل مدینے اور بحر قلزم کے مابین بستے تھے اور انہیں کی سرزمین سے قریشی کاروانوں کو گذرنا پڑتا تھا۔ (ص ۳۵، ۳۶)

مستشرقین کا غلط تاثر

یہ ظاہر یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ آنحضرت صلعم ابھی مدینے "بے خانماں" ساتھیوں کے مدینہ آئے ہیں اور ابھی آپ نے طاقت وقوت کا کوئی مظاہرہ بھی نہیں کیا ہے اور اس کے باوجود چند در چند قبائل ہیں جو قریش جیسی طاقت کے خلاف آپ سے معاہدے کر رہے ہیں، چناں چہ اس موقع پر بعض مستشرقین نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت قریش کے خلاف جو مہم شروع کرنیوالے تھے اس میں شریک کرنے کی غرض سے آپ یہ معاہدے کر رہے تھے اور قبائل کو یہ لالچ تھا کہ وہ ان مہموں میں شریک ہوں گے تو انہیں لوٹ مار کرنے کا بڑا موقعہ ملے گا۔[1]

---

[1] MUHAMMAD IN MEDINA - P.81

لیکن ہم نے اوپر جو کچھ لکھا ہے اس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے علاوہ ازیں معاہدوں کی اصل عبارتیں محفوظ ہیں، ان کے دیکھنے سے دو باتوں کا اندازہ ہوتا ہے (۱) ایک یہ کہ سب نہیں تو بعض قبیلے اس وقت مسلمان ہو گئے تھے اور (۲) دوسرا یہ کہ معاہدہ میں جس بات کا خاص طور پر تذکرہ ہے وہ جنگ کے وقت باہمی مدد ہے چنانچہ جھینہ کی شاخ بنو زرعہ اور بنو ربعہ سے آپ نے جو معاہدہ کیا اس کے الفاظ یہ ہیں :-

انہم آمنون علیٰ انفسہم	یہ لوگ اپنی جان اور اپنے مال میں محفوظ رہیں گے
واموالہم وان لہم النصر علی	اور اگر کوئی ان پر ظلم کریگا یا ان سے جنگ کرے گا
من ظلمہم او حاربہم الا	تو اس کے برخلاف ان کی مدد کی جائے گی البتہ ہاں
فی الدین والاہل، والاہل	دین یا متعلقین کے لئے جو جنگ ہوگی وہ اس
بادیتہم من برّ منہم واتقی	سے مستثنیٰ ہے، اور ان کے دیہات والوں کے
مالحاضرتہم۔	(بشرطیکہ وہ نیک ہوں) وہی حقوق ہونگے جو ان کے
(الوثائق السیاسیہ ص ۱۳۸)	شہر والوں کے ہیں۔

بنو ضمرہ کے ساتھ معاہدہ کے الفاظ یہ تھے :-

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ دستاویز ہے محمد رسول اللہ کی طرف سے بنو ضمرہ کے لئے اس بات کی کہ یہ لوگ اپنی جان اور مال میں محفوظ رہیں گے اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا ہم ان کی مدد کریں گے، مگر ہاں! جب ان سے اللہ کے دین کے بارے میں جنگ کی جائے اور ہاں جب نبی ان کو اپنی مدد کے لئے بلائے گا تو یہ اس کو قبول کریں گے۔"

(ص ۱۴۳)

بنو ضمرہ کے سردار مجدی بن عمرو سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کا مضمون یہ تھا:-

"محمد رسول اللہ بنو ضمرہ سے جنگ نہیں کریں گے اور نہ بنو ضمرہ آپ سے جنگ کریں گے اور نہ وہ محمد رسول اللہ کے خلاف کسی جماعت یا گروہ کی مدد کریں گے" (ص ۱۴۴)

عہدِ نبوی کے غزوات و سرایا اور اُن کے مآخذ

(۵)

سعید احمد اکبر آبادی

ایک سوال اور اس کا جواب مستشرقین سے قطع نظر! ایک سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ قبائل جن سے معاہدہ ہوا تھا انہیں اس بات کا اندازہ تو ضرور ہوگا کہ عن قریب قریش میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جنگ برپا ہونیوالی ہے۔ اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ قریش کا قبیلہ دولت و ثروت تنظیم اور شجاعت و بہادری کے اعتبار سے سب میں ممتاز تھا اور اسی کے بالمقابل دنیوی اسباب اور مال و متاع کے لحاظ سے مسلمانوں کی بے سرو سامانی بھی ظاہر تھی، تو پھر آخر وہ کیا اسباب و دواعی تھے جن کے باعث ان قبائل نے قریش کے مقابلہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ یہ معاہدہ کیا۔

جواب یہ ہے کہ اس کے اسباب دو وجوہ تھے :-

(۱) ایک یہ کہ اگرچہ یہ قبائل اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے عمل و کردار اور اخلاق و شمائل کے باعث اسلام ان کے قلب و دماغ کے دروازہ پر دستک دینے لگا تھا اور اندرونی طور پر یہ اس کی طرف ایک کشش محسوس کرنے لگے تھے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ قریش کی چودھراہٹ اور آج کل کی اصطلاح میں ان کی سرمایہ دارانہ ذہنیت نے ان تمام قبائل کو پریشان اور خوف زدہ کر رکھا تھا، اور ساتھ ہی یہ قبائل اپنی

باہمی خانہ جنگیوں اور غیر مطمئن زندگی سے سخت تنگ آچکے اور بیزار ہو چکے تھے اس بنا پر اب مستقبل کے افق پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زیر قیادت اسلام کی صورت میں ایک نئی طاقت و قوت ابھرتی ہوئی نظر آئی تو اس سے متاثر ہونا اور قریش اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان جنگ کی صورت میں کم از کم غیر جانبدار رہنا امن کے لئے طبیعت کا ایک تقاضا تھا۔

یہود سے معاہدہ | قبائل مذکورہ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے بھی معاہدہ کیا اس میں اختلاف ہے کہ یہ معاہدہ کب ہوا تھا؟ ولہاسن (Wellhausen) کا خیال ہے کہ یہ معاہدہ غزوۂ بدر کے بعد ہوا تھا لیکن ہوبرٹ گرم (Hubert Grimme) اور پروفیسر کیتانی (Caetani) دونوں کی رائے ہے کہ یہ واقعہ بدر سے پہلے کا ہے[1]۔ اور ہمارے نزدیک صحیح اور اقرب الی الصواب یہی ہے۔ اصل یہ ہے جیساکہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ معاہدہ کی بعض دفعات میں جہاد فی سبیل اللہ اور قریش کے برسر پرخاش ہونے کا تذکرہ ہے اس سے ولہاسن نے قیاس کیا ہے کہ معاہدہ بدر کے بعد واقع ہوا ہے۔ حالانکہ ان دفعات میں اُن واقعات کا بر سبیل حفظ ماتقدم تذکرہ کیا گیا ہے جن کا وقوع مستقبل میں متوقع ہے، چنانچہ پروفیسر کیتانی نے اس بنیاد پر ولہاسن کے خیال کی تردید کی ہے علاوہ ازیں جیساکہ پروفیسر مونٹگمری نے لکھا ہے اس دستاویز میں مسلمانوں اور یہودیوں کو ایک قوم (امۃ واحدۃ) کہا گیا ہے، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ بدر سے پہلے کا ہے۔

دستاویز معاہدہ | اگرچہ یہ سیاسی دستاویز سینتالیس (۴۷) دفعات پر مشتمل اور بہت طویل ہے، لیکن چونکہ بہت اہم ہے اس لئے ہم بجنسہٖ اس کا ترجمہ نقل کرتے ہیں :-

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(۱) یہ ایک تحریر ہے محمد رسول اللہ کی طرف سے قریش کے مومنوں اور مسلمانوں کے درمیان

---

(1) Mohammad in Madina, P. 225, 226.

اور اہل یثرب کے اور ان لوگوں کے درمیان جو ان کے تابع ہوں، ان سے ملحق ہوں اور جو ان کے ساتھ جہاد کریں۔

(۲) یہ سب لوگ اور لوگوں کو مستثنیٰ کر کے ایک قوم (امۃ واحدۃ) ہیں۔

(۳) مہاجرین قریش اپنی سابقہ حالت کے مطابق باہمی طور پر اپنا خون بہا ادا کریں گے اور وہ (بحیثیت ایک جماعت کے) اپنے قیدیوں کا فدیہ، راستبازی اور عدل بین المؤمنین کے ساتھ ادا کرینگے۔

(۴) بنو عوف حسب سابق اپنا پہلا خون بہا ادا کرینگے، اور ہر شاخ معروف اور عدل بین المومنین کے ساتھ اپنے قیدیوں کا زرفدیہ ادا کریگی۔

(۵) (۶) (۷) (۸) (۹) (۱۰) خزرج کے بنو الحارث، بنو ساعدۃ، بنی جشم، بنو النجار، بنو عمرو بن عوف، بنو النبیت اور بنو الاوس یہ سب دفعہ نمبر ۳ کے مطابق اپنا اپنا خون بہا اور قیدیوں کا زرفدیہ ادا کریں گے۔

(۱۱) مؤمنین اپنے کسی قرضخواہ کو زرفدیہ یا خون بہا ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرینگے۔

(۱۲) کوئی مومن کسی دوسرے مومن کے مولیٰ (بطور ستارہ) کو اسکی اجازت کے بغیر اپنا حلیف نہیں بنائیگا۔

(۱۳) اللہ سے خوف کرنیوالے مومنین متحدہ طور پر اس ہر شخص کے خلاف ہونگے جو انمیں سے ظلم و زیادتی کریگا، یا کسی معصیت اور مومنین کے درمیان فسادانگیزی کا مرتکب ہوگا، اگرچہ یہ شخص انکا بیٹا ہی ہو۔

(۱۴) کوئی مومن کسی مومن کو کسی کافر کی وجہ سے قتل نہیں کریگا اور نہ کسی مومن کے خلاف کسی کافر کی مدد کرے گا۔

(۱۵) اللہ کی حفاظت سب کے لئے یکساں ہے، ہمسائگی کی پناہ مومنین کے ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کیلئے بھی ہے، اور مومنین اور لوگوں کو مستثنیٰ کر کے باہم دگر ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہونگے۔

(۱۶) یہود میں سے جو لوگ ہمارے تابع ہونگے ان کی مدد کی جائیگی اور ان کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو مومنین کے ساتھ کیا جائیگا۔ نہ ان پر ظلم کیا جائیگا اور نہ ان کے برخلاف ان کے دشمن کو مدد دیجائیگی۔

(۱۷) مؤمنین کا نظام امن ایک ہے، جہاد فی سبیل اللہ کے معاملہ میں کوئی ایک مومن دوسرے مومن کو نظر انداز کر کے صلح نہیں کریگا۔ مگر ہاں سب مؤمنین کی مرضی اور عدل کی اساس پر صلح ہوسکتی ہے۔

(۱۸) ہمارے ساتھ مل کر جو جماعتیں جنگ میں حصہ لیں گی وہ نوبت بنوبت حصہ لے سکتی ہیں۔

(۱۹) جو مومن اللہ کے راستے میں اپنی جان دینگے ان کا انتقام لینے کا حق مومنین کو باہمدگر ہوگا۔

(۲۰ الف) اللہ سے خوف کرنے والے مومنین بہترین ہدایت اور راستبازی پر قائم رہیں گے۔

(۲۰ ب) کوئی مشرک قریش کے کسی شخص کی ذات یا اس کے مال کو پناہ نہیں دیگا اور نہ مومن کے خلاف اس کی مدد کریگا۔

(۲۱) اگر کوئی مؤمن کو ناحق قتل کریگا اور اس کا ثبوت بھی موجود ہوگا تو اس سے قصاص لیا جائیگا، مگر ہاں اگر مقتول کے ورثاء رضامند ہوں تو اس کا خون بہا بھی لیا جاسکتا ہے بہرحال مومن سب قاتل کے خلاف ہونگے، اور ان کے لئے یہی جائز ہے۔

(۲۲) جو مومن اس دستاویز کے مندرجات کا اعتراف کرتا اور اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی فتنہ گر کی مدد کرے یا اس کو ٹھکانہ دے، اور جو ایسا کریگا اس پر قیامت کے دن اللہ کی لعنت اور اس کا غضب ہوگا۔ اور اسکے بدلے میں اس سے کوئی چیز قبول نہیں کی جائیگی۔

(۲۳) تم جب کبھی کسی معاملہ میں اختلاف کروگے تو اس کا فیصلہ اللہ اور محمدؐ سے کرانا ہوگا

یہاں تک دستاویز میں ان تعلقات کا تذکرہ تھا جو مسلمانوں اور اہل یثرب کے درمیان تھے اور جن میں یہود بھی شامل تھے، اب اس کے بعد کا جو حصہ ہے وہ یہود کے لئے مخصوص ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:-

(۲۴) یہود مومنین کے ساتھ خرچ کرینگے جب تک وہ (مسلمان بر سر جنگ رہینگے

(۲۵) بنو عوف قبیلہ کے یہود اور مومنین ایک قوم ہیں، یہود کے لئے ان کا دین ہے

اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین ۔اس میں جو جس کا مولی (Clients) ہے اس کا حکم بھی وہی ہے ۔مگر وہ لوگ مستثنی ہیں جو ظلم یا کسی معصیت کا ارتکاب کریں، ایسے لوگ اپنی ذات اور اپنے گھر والوں کے لئے ہی ہلاکت کا باعث ہونگے ۔

(۲۶) (۲۷) (۲۸) (۲۹) (۳۰) یہود بنو النجار ۔یہود بنو الحارث ،یہود بنو ساعدہ ۔یہود بنو جُشَم ، یہود بنو الاوس ان سب کے لئے وہی حقوق و مراعات ہونگے جو یہود بنو عوف کیلئے ہیں ۔

(۳۱) یہود بنو ثعلبہ کے لئے وہی حقوق و مراعات ہیں جو یہود بنو عوف کے لئے ہیں مگر ہاں ! ان میں جو شخص ظلم کریگا یا معصیت کا مرتکب ہوگا وہ خود اپنے نفس کو اور گھر والوں کو ہی ہلاک کریگا ۔

(۳۲) جفنہ جو ثعلبہ کی ایک شاخ ہے ادن کا حال ثعلبہ جیسا ہو گا ۔

(۳۳) بنو شطیبہ کے لئے وہی حقوق و مراعات ہیں جو بنو عوف کے لئے ہیں اور انکا دارو مدار نیکی (بر) پر ہے نہ کہ معصیت پر ۔

(۳۴) موالی ثعلبہ بھی انھیں جیسے ہوں گے ۔

(۳۵) یہود کے عزیز قریب اور ان کے دوست احباب (لبطانہ) جو ان سے نسلی رشتہ نہیں رکھتے ان کے حقوق اور مراعات بھی وہی ہوں گے جو یہود کے ہیں ۔

(۳۶) جو لوگ ایک امت میں داخل ہیں ان میں کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اجازت کے بغیر کسی سے جنگ نہیں کریگا ۔

(۳۶ ب) البتہ ہاں ! اگر کسی کو کوئی زخم پہنچا ہے تو اس کو انتقام لینے کی اجازت ہے اور جو کوئی شخص بے سوچے سمجھے کوئی کام کریگا اس کے لئے وہ خود اور اسکے گھر کے لوگ ذمہ دار ہونگے ۔مگر ہاں اس وقت نہیں جب کہ اس شخص پر ظلم کیا گیا ہو اللہ اس دستاویز کا سب سے زیادہ سچا گواہ اور اسے پورا کرنیوالا ہے ۔

(۳۷) یہود اپنا خرچ اٹھائیں گے اور مسلمان اپنا خرچ اٹھائیں گے اور جن لوگوں کا ذکر اس دستاویز

میں ہے ان سے اگر کوئی گروہ جنگ کریگا تو ان کے برخلاف یہود اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کی مدد کرینگے، اور یہود اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خیراندیشی، خیرسگالی اور نیکی کا معاملہ کرینگے، نہ کہ معصیت کا۔

(۳۷ ب) کوئی شخص اپنے حلیف کی معصیت کے باعث ماخوذ نہیں ہوگا اور مظلوم مدد کا مستحق ہوگا۔

(۳۸) جب تک مسلمان جنگ جاری رکھیں گے مسلمانوں کے ساتھ یہود بھی اسکا خرچ اٹھائیں گے۔

(۳۹) جو قبیلے اس دستاویز میں شریک ہیں ان کے لئے یثرب حرم ہے۔

(۴۰) پڑوسی کا حق وہی ہے جو اس شخص کا ہے جس کے پڑوس میں وہ ہے، بشرطیکہ وہ نقصان نہ پہونچائے اور معصیت کا مرتکب نہ ہو۔

(۴۱) کسی عورت کو اس کے متعلقین کی اجازت کے بغیر پناہ نہ دی جائیگی۔

(۴۲) اس دستاویز کے لوگوں میں جب کبھی کوئی اختلاف یا نزاع ہوگا تو اس معاملہ میں اللہ اور محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اللہ اس دستاویز کا سب سے زیادہ سچا گواہ اور اس کی نگرانی کرنیوالا ہے۔

(۴۳) قریش یا ان کے اعوان و انصار کو پناہ نہیں دی جائیگی۔

(۴۴) جو گروہ یثرب پر حملہ کریگا اسکے برخلاف اس دستاویز کے سب لوگ ایک دوسرے کی مدد کرینگے

(۴۵) جب ان کو صلح کی دعوت دیجائیگی تو بہ صلح قبول کرینگے اور اسے نافذ کرینگے اور جب اہل صحیفہ میں سے کوئی خود صلح کی دعوت دیگا تو اس کو ایسا کرنے کا حق ہوگا اور مسلمانوں پر اس کی پابندی لازمی ہوگی۔ مگر ہاں اس وقت نہیں کہ جب کہ جنگ دین کے لئے ہو۔

(۴۵ ب) تمام لوگوں کو (جنگ میں) اپنا وہ حصہ پورا کرنا ہوگا جو ان کی طرف نکلے۔

(۴۶) قبیلۂ اوس کے یہود اور ان کے موالی کے حقوق اور مراعات وہی ہونگے جو اس صحیفہ (دستاویز) کے لوگوں کے ہیں، بشرطیکہ وہ نیکی کے راستے پر گامزن رہیں۔ معصیت کوش آدمی خود اپنے کو ہلاکت میں ڈالتا ہے اور اللہ اس صحیفہ کا سب سے زیادہ سچا گواہ ہے۔

(۴۷) یہ دستاویز کسی ظالم یا بدانسان کو پناہ نہیں دیگی، جو شخص مدینہ سے باہر جائے یا مدینہ میں رہے وہ محفوظ ہے، مگر ظالم یا بدانسان کے لئے کوئی پناہ نہیں، بے شک اللہ اور محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کے لئے پناہ ہیں جو نیک اور متقی ہیں[۵۱]

مدینہ کی پہلی اسٹیٹ تعجب ہے کہ ابن اسحاق، ابن ہشام اور ابن کثیر کے علاوہ مورخین سیرت نے اس دستاویز کے ساتھ زیادہ اعتنا نہیں کیا/ انھوں نے سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں کیا ہے تو جزوی اور ضمنی طور پر، حالانکہ یہ اس اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ جیسا کہ مستشرقین میں پروفیسر ڈلہاوزن اور پروفیسر منٹگری نے اور محققین علمائے اسلام میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے لکھا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک اسٹیٹ قائم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ اسکو فیڈرل یعنی وفاقی ریاست کہتے ہیں جس کے صدر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے[۵۲] اور یہ دستاویز اس مملکت کا دستور (Constitution) تھا جس کی رو سے شہر مدینہ ایک حرم اور سیاسی وحدت یا ایک شہری مملکت قرار دیا گیا۔

چند تنقیحات اس سلسلے میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا جواب دینا ضروری ہے

(۱) پہلا سوال یہ ہے کہ اس دستور میں یہود کے تمام قبیلوں کا ذکر ہے لیکن ان کے تین مشہور قبائل بنو النضیر، بنو قینقاع اور بنو قریظہ کا ذکر نہیں ہے، اس کی کیا

---

[۵۱] الوثائق السیاسیۃ۔ ڈاکٹر محمد حمید صفحہ ۱۷

[۵۲]۔ الوثائق السیاسیۃ ص ۲۰۰ و عہد نبوی کے میدان جنگ ص ۲۰۔

وجہ ہے؟ کیا یہ قبیلے معاہدہ میں شریک نہیں تھے، جواب یہ ہے کہ جیساکہ روایات سے ثابت ہے۔ ان تینوں قبیلوں سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاہدہ تھا چنانچہ علامہ ساعاتی لکھتے ہیں:-

وقد کان الکفار بعد الہجرۃ مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی ثلاثۃ اقسام، قسم وادعھم علی ان لا یحاربوہ ولا یالبوا علیہ عدوہ وھم طوائف الیھود الثلاثۃ، قریظۃ والنضیر وبنو قینقاع (حاشیہ مسند امام احمد بن حنبل ۔ ج ۲۱ ص ۷۷ ۔

ہجرۃ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معاملہ رکھنے والے کفار تین قسم کے تھے، ان میں ایک قسم ان لوگوں کی تھی جن سے حضورؐ نے اس بات کا معاہدہ کیا تھا کہ وہ آپ سے جنگ نہیں کریں گے اور نہ آپ کے دشمن کو شہ دیں گے اور یہ لوگ یہود کے تین طبقے قریظہ، النضیر اور بنو قینقاع تھے۔

لیکن اس کے باوجود زیر بحث دستاویز میں ان کے نام جو نہیں ہیں تو ہمارے نزدیک جیساکہ پروفیسر منٹگمری نے لکھا ہے، یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ والہ وسلم نے اس دستور میں یہود کی گروپ بندی ان عرب قبائل کے اعتبار سے کی ہے جن کے علاقوں میں یہ رہتے تھے۔ اس بنا پر بنو النضیر اور بنو قریظہ اوس اور ثعلبہ کے یہود میں شمار ہونگے، کیونکہ یہ لوگ ان کے درمیان رہتے تھے[1] اب رہے بنو قینقاع! تو چونکہ یہ بھی ان دونوں کے بیچ میں رہتے تھے[2] اس لئے یہ بھی ان میں شامل ہوں گے، علاوہ ازیں جب معاہدہ کے شروع میں ہی اہل یثرب قرار دیا گیا تو یہ تینوں قبیلے بھی اس میں آگئے۔

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دستاویز میں مدینہ کو حرم قرار دیا ہے اسکی کیا حقیقت ہے؟ اسکی توضیح میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں:-

حرم کی اصطلاح ایک نیم مذہبی اور نیم سیاسی مفہوم رکھتی ہے، .....

(1) Mohammad in Madina P. 226-227

(۲) تاریخ العرب قبل الاسلام جواد علی ج ۴ ص ۱۰

اس کا مذہبی مفہوم یہ تھا کہ وہاں کی ہر چیز کو ایک تقدس حاصل ہے۔ وہاں کے چرند پرند کا شکار نہ کیا جائے، وہاں کے درخت نہ کاٹے جائیں، وہاں خونریزی نہ کی جائے اور وہاں آنیوالوں کو دورانِ قیام میں امن اور پناہ میں سمجھا جائے خواہ وہ مجرم ہی کیوں نہ ہو، حرم کا سیاسی مفہوم یہ تھا کہ وہ اس شہری مملکت کی حدود کا تعین کرتا تھا۔ لہ

(۳) تیسرا سوال یہ ہے کہ یہ عہد نامہ ایک ہی مرتبہ ہوا ہے، یا مختلف اوقات میں جستہ جستہ ہوا ہے۔ اس میں کافی اختلاف ہے لیکن ہمارے نزدیک زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ معاہدہ مختلف اوقات میں ہوا ہے اور ابن اسحٰق نے ان سب معاہدوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں بعض دفعات مکرر ہو گئی ہیں۔

سریہ اور اس کی حقیقت اب جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اندرونی مسائل ومعاملات کی تنظیم وترتیب اور داخلی تحفظات کے انتظام وانصرام سے فارغ ہو گئے تو آپ نے وقت کے سب سے اہم مسئلہ یا قریش کی طرف توجہ کی، اس سلسلہ میں آپ کا پہلے سے سوچا اور سمجھا ہوا منصوبہ یہ تھا کہ قریش کی تجارتی لائن کو منقطع کر دیا جائے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو آج کل کی اصطلاح میں معاشی اور اقتصادی مزاحمت (Economic Blockade) کہتے ہیں۔ قریش کی طاقت وقوت کا دارومدار جو کچھ تھا وہ تجارت اور نہایت وسیع پیمانہ پر کاروبار تھا اور شام وایران وغیرہ جانے کے لئے قریش کے تجارتی قافلوں کا مدینہ کے راستے سے گذرنا ضروری تھا جس پر اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبضہ تھا اور اقتصادی مزاحمت (Economic Blockade) کا مقصد کہیں بھی ابتداءً جنگ شروع کر دینا نہیں ہوتا۔ بلکہ دشمن کو تنگ اور

---

(۱) عہد نبوی کے میدان جنگ صفحہ ۔

پریشان کرکے اوس کو اس معاندانہ روش سے باز رکھنا ہوتا ہے جو اوس نے اختیار کر رکھی ہے ۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ آپ اقتصادی مزاحمت کی جو مہم شروع کرنیوالے ہیں اس کے نتیجے دو ہی ہوسکتے ہیں ۔

(۱) ایک یہ کہ قریش تنگ آکر اور پریشان ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور ہونگے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کے خلاف اپنی معاندانہ روش سے باز آجائیں گے اور آزادی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے آپ کے حق کو تسلیم کرلیں گے (۲) اور دوسرا یہ کہ قریش اس اقتصادی مزاحمت کو اعلان جنگ سمجھ کر برسرپیکار ہونگے ۔

اقتصادی مزاحمت کے نتیجے اگرچہ دونوں ہوسکتے تھے ۔لیکن بدر کی جنگ جس طرح اچانک شروع ہوئی اور مسلمان اس میں جس بے سروسامانی کے عالم میں شریک ہوئے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رجحانِ خاطر پہلے نتیجہ کی طرف تھا اور آپ کو توقع تھی کہ قریش مجبور ہوکر صلح کرلیں گے اور اپنی حرکات سے باز آجائیں گے ۔

بہرحال اب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "سرایا" مقرر کئے ، سرایا جمع سریہ کی ہے اور اس کا مادۂ اشتقاق "سُرئی" ہے جس کے معنی رات کو چلنا اور سفر کرنا ہیں ۔ مؤرخین سیرت نے غزوہ اور سریہ دونوں کو خلط ملط کردیا اور سریہ پر بھی بے تکلف غزوہ کے لفظ کا اطلاق کردیتے ہیں ، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے ۔ غزوہ کے معنی جنگ ہیں جو دن کے وقت اور دوبدو ہوئی ہے اور اس میں دشمن سے کھلا مقابلہ ہوتا ہے ، اس کے برخلاف سریہ کا کام اور اس کی نقل وحرکت پوشیدہ ہوتی ہے ۔ سریہ کا ٹھیٹ ترجمہ اور اس کی حقیقت وہ ہے جو انگریزی میں لفظ *Reconnaissance* کی ہے اور جیسے ہم اردو میں "گشتی دستہ" یا "چھاپہ مار دستہ" کہہ سکتے ہیں ۔ اس دستہ کے مقاصد حسب ذیل تھے :-

(۱) دشمن کی نقل وحرکت کی خبر رکھنا اور اُن کی ٹوہ لینا۔

(۲) جاسوسی کرنا۔

(۳) بے خبری میں دشمن پر چھاپہ مارنا۔

(۴) جو لوگ فتنہ انگیزی اور فساد پروری کر رہے ہوں ان کی سرزنش کرنا۔

ان مقاصد کے ماتحت سریہ کے لوگوں کی تعداد متعین نہیں تھی، اس کا انحصار اس مقصد پر تھا جس کے لئے سریہ بھیجا جاتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رجب سنہ ۲ھ میں حضرت عبد اللہ بن جحش کی سرکردگی میں جو دستہ بھیجا گیا تھا اس میں حسب روایات کم از کم سات اور زیادہ سے زیادہ بارہ آدمی تھے۔ پھر علی الترتیب اسی سنہ کے ماہ رجب اور شعبان میں عصماء اور ابوعفک کی سرکوبی کے لئے جو دستے بھیجے گئے وہ صرف ایک ایک شخص یعنی عمیرؓ اور سلیمؓ پر مشتمل تھے۔ سنہ ۳ھ میں بماہ ربیع الاول کعب بن اشرف یہودی کے قتل کے لئے جو دستہ حضرت محمد بن مسلمہؓ کی سرکردگی میں گیا تھا وہ پانچ افراد پر مشتمل تھا غرض کہ سرایا کا اسی حیثیت سے جائزہ لیجئے تو ایک سریہ میں آپ کو کہیں تھوڑے اور کہیں زیادہ افراد ملیں گے۔ سب سے بڑا سریہ غالباً وہ ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنی سرکردگی میں قریش کے کاروانِ تجارت کی ٹوہ میں سنہ ۲ھ کے ماہ صفر میں ابواء لے گئے تھے۔ اور جس کو مورخین وارباب سیرت عام طور پر غزوہ ابواء یا غزوہ ودّان[۱] کے نام سے ذکر کرتے

[۱] ابواء اور ودان مدینہ سے مکہ کے راستے پر دو گاؤں تھے۔ یاقوت حموی کے بیان کے مطابق ان دونوں میں آٹھ میل کا فاصلہ تھا۔ ودان میں قبیلہ ضمرہ، غفار اور کنانہ آباد تھے۔

صراطِ مستقیم (انگریزی)

دی بلینڈ فیلے کے نام سے انگریزی زبان میں اسلام کی صداقت پر ایک معزز یوروپین نومسلمہ خاتون کی یہ مختصر اور بہت اچھی کتاب۔ محترم خاتون نے اپنے اسلام قبول کرنے کے مفصل وجوہ بھی تحریر کئے ہیں۔ یہ ایڈیشن نہایت اہتمام سے صحت کے ساتھ طبع کرایا گیا ہے۔ جلد خوبصورت (فل کلاتھ بائنڈنگ) قیمت للعہ روپے۔

ہیں۔ اس سریہ میں ساٹھ افراد شامل تھے لے

غزوات وسرایا کی تعداد | غزوات وسرایا کی تعداد کیا تھی؟ اس بارہ میں اختلاف ہے امام احمد بن حنبل نے ان سب روایات کو یکجا کر دیا ہے اور ابن سعد نے بالترتیب انھیں نام بنام لکھا ہے لیکن ہمارے زمانے کے علمائے محققین کا جس پر اتفاق ہے اور جو ابن سعد کے بیان پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ وہ غزوات جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شریک ہوئے ہیں ان کی تعداد ستائیس ہے۔ ان میں سے سات غزوات میں آپ نے خود جنگ میں بھی حصہ لیا ہے، ان کے نام یہ ہیں:-

بدر۔ احد۔ المریسیع۔ خندق۔ قریظہ۔ خیبر۔ فتح مکہ۔ حنین اور الطائف اور جو ستے اور سرایا آپ نے روانہ کئے ہیں۔ وہ گنتی میں سینتالیس ہیں۔

"لیکن یہاں دو باتیں ملحوظ خاطر رکھنے کی ہیں"

(۱) ایک یہ کہ اوپر جن کو غزوات یا سرایا کہا گیا ہے ضروری نہیں کہ اون سب میں جنگ اور قتل وقتال کی نوبت آئی ہو۔ مثلاً فتح مکہ صلحاً ہوا ہے نہ کہ عنوۃً، اور سرایا میں تو ایک دو نہیں، بلکہ اس کی مثالیں کثرت سے ہیں۔

(۲) دوسری یہ کہ جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ نے فوجوں کی کمان (Command) اور ان کی قیادت اور صفوں کی ترتیب وغیرہ کی ہے،

لے واضح رہنا چاہئے کہ یہ ہماری ذاتی رائے ہے، ورنہ ہمیں معلوم ہے کہ کتب تاریخ وسیر میں ساٹھ سے زیادہ افراد پر مشتمل دستہ پر بھی سریہ کا اطلاق کیا گیا ہے مثلاً ۸ھ میں غزوہ سیف البحر جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح کی سرکردگی میں تین سو آدمیوں کا جو لشکر بھیجا تھا ارباب سیر نے اس کو بھی کہیں غزوہ کہا ہے اور کہیں سریہ کہا ہے۔ حالانکہ درحقیقت نہ وہ غزوہ ہے اور نہ سریہ، بلکہ وہ ایک فوجی دستہ تھا جو (صلح حدیبیہ کے بعد) قریش کے کاروان تجارت کی قبیلۂ جہینہ سے حفاظت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس قسم کے دستوں کے لئے صحیح لفظ "بعوث" ہے جو سیرت کی بعض کتابوں میں مستعمل بھی ہوا ہے۔

ورنہ آپؐ کی شانِ رحمۃ للعالمین کا یہ بھی ایک عجیب قدرتی مظاہرہ ہے کہ اتنی لڑائیاں ہوئیں، سخت سے سخت معرکے پیش آئے۔ لیکن کہیں کسی روایت سے ثابت نہیں ہے کہ آپ نے کسی دشمن پر تلوار اٹھائی یا اسے قتل کیا ہو، غزوۂ احد میں نصیبِ دشمناں کیا کچھ نہیں ہوا! دشمن تیر برسا رہے تھے۔ ایک بدبخت نے یہاں تک جرأت کی کہ قریب آکر تلوار سے ایسا وار کیا کہ تلوار خود پر پڑی اور اس سے چہرۂ مبارک پر خراش آگئی لیکن اس وقت بھی جاں نثاروں کے حلقہ میں گھرے ہوئے رحمتِ عالم کی زبان مبارک "رب اغفر قومی فانھم لا یعلمون" اے میرے پروردگار میری قوم کو بخشدے کیونکہ وہ جانتے نہیں ہیں۔" کی صدائے لاہوتی سے تو زمزمہ سنج تھی لیکن دستِ اقدس کو کسی نے نہیں دیکھا کہ اس میں تلوار لہرائی ہو۔"

مہم کا آغاز بہرحال اب وقت آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مہم یعنی قریش کے کارواں تجارت سے تعرض (Interception) کو شروع کرنے کا عزم فرمالیا اس سلسلہ میں آپ نے مختلف اوقات میں مختلف دستے روانہ کئے جن کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) سب سے پہلا دستہ جس میں خود آپ بھی تھے ماہ صفر ۲ھ میں ودان یا ابواء کے لئے روانہ ہوا۔ اسمیں کہیں قریش سے دوچار ہونے کا موقع نہیں ہوا۔ بنی ضمرۃ بن عبد مناۃ قبیلہ اس جگہ کے آس پاس ہی رہتا تھا۔ آپ نے ان سے مصالحت کرلی جس کا ذکر گذرچکا ہے۔ اس کے بعد آپ واپس آگئے۔[۱]

ارباب سیر کا عام طریقہ ہے کہ ہر وہ مہم (Expedition) جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوں اس کو غزوہ کہتے ہیں اس بنا پر انھوں نے اس کو بھی غزوۂ ودان یا غزوۂ ابواء کہا ہے حالاں کہ جب دشمن سے مڈبھیڑ بھی نہیں ہوئی تھی تو

[۱] ابن ہشام ج ۲ ص ۲۴۱۔

اس پر غزوہ (جنگ) کے لفظ کا اطلاق اصطلاحاً ہی ہو سکتا ہے حقیقتہً نہیں۔

(۲) اس کے کچھ دنوں بعد آپ نے حضرت حمزہ بن عبد المطلبؓ کی سرکردگی میں تیس مہاجر کا ایک دستہ سمندر کے ساحل (سیف البحر) کی طرف عیص کے نواح میں بھیجا، اس دستہ کی مڈبھیڑ ابوجہل کے ساتھ ہوئی جو کفار مکہ کے تین سو سواروں کے ساتھ تھا۔ لیکن مجدی بن عمرو الجہنی نے بیچ میں پڑکر معاملہ رفع دفع کرا دیا اور جنگ کی نوبت نہیں آئی۔[1]

(۳) انھیں دنوں میں آپ نے ایک اور دستہ حضرت عبیدۃ بن الحارثؓ کی سرکردگی میں ساٹھ یا اسی مہاجرین کا بمقام احیاء[2] جو مرہ کی گھاٹی کے نشیب میں ایک جگہ کا نام ہے روانہ کیا، لیکن یہاں بھی کوئی جھڑپ نہیں ہوئی۔ البتہ حضرت سعد بن ابی وقاص ایک تیر سے زخمی ہو گئے اور ادھر دو مسلمان جو مکہ میں پھنسے ہوئے تھے اور اس وقت ابوجہل کی جمعیت میں تھے وہ موقع پاکر مسلمانوں سے آملے۔ ان کے نام مقداد بن عمرو اور عتبہ بن غزوان ہیں۔

(۴) اسی سن کے ماہ ربیع الآخر (بعض روایات کے مطابق ربیع الاول) میں قریش کے قافلہ، تجارت کی جستجو میں جس کا امیرِ کارواں امیہ بن خلف تھا بمقام بواط (ینبع کے قریب جہینہ کا ایک پہاڑ) تک دو سو مسلمانوں کا ایک دستہ لے کر خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے لیکن اس میں بھی دشمن سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی اور واپس آگئے ارباب سیر نے اپنی عادت کے مطابق اسے بھی غزوہ کہا ہے۔

(۵) ماہ جمادی الاولیٰ کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ڈیڑھ سو یا

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۲۴۴ - [2] عام مراجع میں مقام کا نام احیاء لکھا ہوا ہے لیکن ڈاکٹر شوقی ضیف نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے (کتاب الدرر والمغازی حاشیہ ص ۱۰۴)۔

بعض روایت کے مطابق دوسو مہاجرین کا ایک دستہ اسی مقصد کے ماتحت لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے اور مقام عُشیرہ تک تشریف لے گئے - بنو مدلج یہیں رہتے تھے - آپ نے ان سے معاہدہ کیا اور واپس آگئے - جنگ کی نوبت اس مرتبہ بھی نہیں آئی، حالانکہ ارباب سیر نے اسے بھی غزوہ شمار کیا ہے

(۶) انھیں دنوں میں کرز بن جابر الفہری جو بعد میں مسلمان ہوکر مدینہ آگئے تھے - انھوں نے مدینہ کی چراگاہوں پر حملہ کیا اور کچھ جانور لے بھاگے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے تعاقب میں حضرت سعد بن وقاص کو بیس مہاجرین کی معیت میں روانہ کیا، لیکن کرز بن جابر ہاتھ نہیں آیا اور حضرت سعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ مقام خرار (مکہ اور مدینہ کے درمیان) ایک وادی تک جاکر واپس آگئے -

(۷) اسی سلسلہ میں ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی مدینہ سے نکلے اور وادی سفوان تک گئے تھے، لیکن کرز آپ کے ہاتھ بھی نہیں آیا اور پہلو بچاکر نکل بھاگا اور آپ مدینہ واپس آگئے - ارباب سیر اسکو بھی غزوۂ بدر اولیٰ کہتے ہیں[۵]

ارباب سیر جو نام چاہیں دیں، لیکن آپ نے دیکھا کہ مذکورۂ بالا سات مہموں میں سے کسی مہم میں بھی نہ جنگ ہوتی ہے، نہ لوٹ مار ہوتی ہے اور نہ دشمن سے کوئی سابقہ (Engagement) ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کیا فعل عبث تھا - جیساکہ مولانا شبلی نے بہ طور طنز لکھا ہے (سیرت النبی ج ۱ حاشیہ صـ ۳۱۳)

جواب یہ ہے کہ ہرگز ایسا نہیں تھا اور اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں -

---

[۵] اوپر جن مہموں کا ذکر ہوا ہے ان سب کا تذکرہ تمام ارباب سیر ابن ہشام ابن سعد، ابن حزم ابن سید الناس، طبری، ابن کثیر وغیرہم نے کیا ہے اور بعض بعض کی روایت صحیح بخاری اور مسند امام احمد بن حنبل میں بھی موجود ہے لیکن ہم نے اس موقع پر حافظ ابن عبدالبر کی مغازی خاص طور پر پیش نظر رکھی ہے -

(۱) اگرچہ بنیادی طور پر مرکز توجہ قریش تھے لیکن اس سلسلے میں دوسرے کام بھی تو کرنے کے تھے، مذکورہ بالا مہموں کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمبر ۱ و ۵ میں بنوضمرہ اور بنومدلج سے معاہدہ کیا۔ اور یہ بجائے خود بہت اہم ہے۔ نمبر ۲ میں اگرچہ جنگ نہیں ہوئی لیکن ابوجہل اور دوسرے سرداران قریش کو یہ جتا دیا کہ اب مسلمانوں کے دم خم کیا ہیں۔ جنگ کے نقطۂ نظر سے یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں نمبر ۳ کا فائدہ یہ ہوا کہ مکہ میں پھنسے ہوئے دو مسلمان ادھر آ گئے۔

(۲) نمبر ۴، ۶، اور ۷ میں اگرچہ کوئی واقعہ پیش نہیں آیا لیکن ان کا فائدہ یہ ضرور ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے مسلمانوں کو یہ تعلیم مل گئی کہ (الف) وہ قریش کے کاروان تجارت کی تاک میں رہیں اور جب کبھی ان کو اس کی کن بھن ملے وہ اس کو چیلنج کرنے کے لئے روانہ ہوں اور (ب) دوسری تعلیم یہ ملی کہ پورا مدینہ ایک حرم اور ایک مملکت ہے، اس بنا پر جو شخص اور جو گروہ بھی مدینہ کی چراگاہ یا اس کی کسی چیز پر دست درازی کرے گا وہ تادیب اور سرزنش کا مستحق ہوگا باقی

تہذیب کی تشکیل جدید

مؤلف مولانا محمد تقی امینی

اخلاق و عادات حسن ذوق و عمل قوموں کے اصول و قوانین ان کی زندگی کے نصب العین وغیرہ یہ چیزیں ہیں جو تہذیب کے دائرے میں آتی ہیں۔ مغربی تہذیب دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، ایک گروہ تو وہ ہے جو مشرق کو مغرب میں دراندازی کا موقعہ دینا نہیں چاہتا دوسرا گروہ وہ ہے جو تکوین و تشکیل کے ہر مرحلے میں مشرق ہی کو اثر انداز مانتا ہے اس افراط و تفریط کی وجہ قومی عصبیت صلیبی جنگیں مطالعہ و تحقیق کی کمی وغیرہ ہے۔ اس کتاب میں تشکیل جدید کے بنیادی خد و خال بیان کرنے کے ساتھ یہ کوشش کی گئی ہے کہ زندگی میں مغربی تہذیب کے اثرات کا کسی قدر تفصیلی ذکر ہو جائے تاکہ دونوں کے تقابلی مطالعے میں سہولت ہو مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لئے ایک محققانہ کتاب ہے کتاب کے مطالعے سے تہذیب کی تشکیل جدید کے تمام عنوانات روشن ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔

عہدِ نبوی کے غزوات و سرایا اور ان کے مآخذ پر ایک نظر

(۶)

سعید احمد اکبر آبادی

سریۂ عبداللہ بن جحش

اس کے بعد ۲ھ کے ماہ رجب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش کی سرکردگی میں آٹھ مہاجرین پر مشتمل ایک دستہ نخلہ روانہ فرمایا جو مکہ سے ایک شب کی مسافت پر ہے اور ساتھ ہی انھیں ایک تحریر دی اور حکم دیا کہ جب تک دو دن کی مسافت طے نہ ہو جائے وہ اسے نہ دیکھیں، پھر جب اسے پڑھیں تو اپنے ساتھیوں میں سے کسی پر جبر نہ کریں۔ حضرت عبداللہ بن جحش نے تعمیل حکم کی، دو دن کے سفر کے بعد جب انھوں نے تحریر پڑھی تو اس میں لکھا تھا: جب تم میری تحریر پڑھو تو اس کے بعد بھی اپنا سفر جاری رکھو، یہاں تک کہ تم نخلہ پہونچو، جو مکہ اور طائف کے درمیان واقع ہے اسی مقام پر قریش کے حالات کا پتہ چلاؤ اور ہمیں ان سے باخبر کرو۔ حضرت عبداللہ بن جحش نے اس فرمانِ نبوی کو پڑھکر کہا: آمنا وصدقنا! اور اپنے رفقا کو اس مضمون سے آگاہ کیا اور یہ بھی فرمایا کہ میں کسی کو مجبور نہ کروں گا۔ لیکن سب نے بالاتفاق کہا کہ ہم سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع و فرماں بردار ہیں، اس لئے جو آپ کا منشا ہے وہی ہمارا بھی ہے، اب یہ مختصر سا قافلہ حجاز کے راستہ پر پھر روانہ ہوا۔ اثنائے راہ میں حضرت

ں وقاص اور حضرت عتبہ بن غزوان کا اونٹ جس پر دونوں باری باری سے سوار
ے گم ہوگیا اور یہ اس کی تلاش میں نکل جانے کے باعث قافلہ سے پیچھے رہ گئے
اللہ بن جحش باقی رفیقوں کے ساتھ چلتے رہے، آخر جب مقام نخلہ میں پہونچے
یہاں قریش کا ایک کاروانِ تجارت ملا جو کشمش اور کچھ اور سامان لا رہا تھا،
نے باہم مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ غور طلب بات یہ تھی کہ اگر وہ کاروانِ
احمت کرتے ہیں اور نوبت جنگ کی آتی ہے تو ماہ رجب چونکہ اشہر حرام میں
اس لئے یہ چیز اس مہینہ کی حرمت کے خلاف ہوگی، اور اگر مزاحمت نہیں کرتے
بلدۂ حرام میں داخل ہو جائے گا۔ انجام کار فیصلہ یہی ہوا کہ کارواں سے تعرض
چنانچہ مسلمانوں نے تیر اندازی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عمرو بن الحضرمی قتل ہوگیا،
ے دو شخص گرفتار ہو گئے اور ایک شخص جس کا نام نوفل بن عبد اللہ تھا فرار

حضرت عبد اللہ بن جحش مع اپنے چھ رفقا کے مال غنیمت اور دو قیدیوں کے ساتھ
پہونچے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے شہر حرام
الحضرمی کے قتل پر کبیدگیٔ طبع کا اظہار کیا اور فرمایا: میں نے تو تمھیں جنگ کرنے
یا تھا۔ محمد بن اسحٰق کی روایت ہے جسے دوسروں نے بھی نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ
ر ان کے ساتھیوں پر بعض صحابہ بھی ناراض ہوئے اور کہا: تم لوگوں نے وہ کام
کا تم کو حکم نہیں دیا گیا تھا (یعنی غارت گری) اور تم نے شہر حرام میں جنگ کی ہے جس
ہیں تھے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر اس درجہ افسوس تھا کہ آپ نے
ور قیدیوں کے قبول کرنے سے انکار فرما دیا۔ یہ دیکھ کر ان حضرات کے چھکے چھوٹ گئے
جب قرآن مجید کی آیت:

عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ، لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ماہ مقدس میں جنگ

قُلْ قِتَالٌ فِیْهِ کَبِیْرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَکُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَکْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ، وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا وَمَنْ یَرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَیَمُتْ وَهُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

(البقرہ)

کرنا کیسا ہے؟ آپ کہدیجئے کہ اس مہینہ میں جنگ کرنا برا ہے، لیکن اللہ کے راستہ سے روکنا، اس کے اور مسجد حرام کے ساتھ کفر کرنا اور اس کے اصل باشندوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اُس سے بھی زیادہ برا ہے، اور فتنہ انگیزی قتل سے بھی زیادہ بری بات ہے اور (ہاں اے مسلمانو دیکھو) یہ کفار قریش تم سے اس وقت تک برابر برسرپیکار رہیں گے جب تک کہ وہ تم کو تمھارے دین سے برگشتہ نہ کر دیں گے، بشرطیکہ وہ ایسا کرسکیں، (لیکن تم خوب سمجھ لو کہ) اور تم میں سے جو لوگ اپنے دین سے منحرف ہوں گے اور کفر کی حالت میں مر جائیں گے تو دنیا اور آخرت میں ان کے اعمال بیکار ہو جائیں گے، وہ دوزخی ہوں گے اور دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ (ترجمہ)

نازل ہوئی اور سورۂ انفال کی یہ آیت: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ اور جان لو کہ غنیمت کے طور پر تم کو جو کچھ بھی دستیاب ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے ہے، بھی اتری تو اب حضور نے مال غنیمت میں اپنا حصہ قبول فرمایا اور دو شخص جو قیدی تھے ان کا فدیہ لیکر انھیں رہا کر دیا۔

یہ بات رکھنے کی ہے کہ تاریخ اسلام میں یہ پہلا واقعہ ہے جس میں مسلمانوں کی طرف سے فریق مخالف پر تیر اندازی ہوئی ہے اور اس کے نتیجہ میں ایک شخص قتل ہو گیا، اور مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا ہے، لیکن یہ سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر اور آپ کے منشا

کے خلاف ہوا۔کیونکہ آپ کا مقصد دستہ کے بھیجنے سے صرف قریش کے حالات کی ٹوہ لینا تھا، نہ کہ جنگ کرنا۔یعنی یہ سریہ جاسوسی کی خدمت پر مامور تھا۔ یہ ایک بالکل اتفاقی امر تھا کہ اس دستہ کی مڈبھیڑ ایک کاروانِ قریش سے ہوگئی، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ربط قائم رکھنا ممکن نہیں تھا، اس لئے صحابہ نے اجتہاد سے کام لیا اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ اگر کاروانِ قریش سے اس وقت تعرض نہ کیا گیا تو یہ لوگ مکہ میں جاکر خبر کردیں گے اور مکہ چونکہ وہاں سے قریب ہے ہی اس لئے وہ لوگ یہاں آکر ان کو قتل کردیں گے یا کم از کم گرفتار کرکے لے جائیں گے دستہ کے اس فیصلہ کی صحت کا ثبوت اس سے بڑھکر اور کیا ہوسکتا ہے کہ بعد میں قرآن نے خود اس کی تصویب کردی۔ لیکن جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کا تعلق ہے نفسیات کا ایک طالب علم محسوس کرسکتا ہے کہ رحمتِ عالم کی شان یہاں بھی نمایاں ہے۔

غزوۂ بدر

بہ ظاہر یہ ایک معمولی واقعہ تھا، لیکن درحقیقت اس اعتبار سے بہت اہم تھا کہ ایک طرف اس واقعہ نے قریش کو چوکنا کردیا اور انھیں محسوس ہونے لگا کہ ان کے غرور انانیت ونخوت کے لئے ایک چیلنج پیدا ہوگیا ہے، اس احساس کے بعد اگر ان میں سلامتِ طبع اور دور اندیشی کا جوہر ہوتا تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر مصالحت کرلیتے کہ اب وہ مسلمانوں کو نہ مسجد حرام سے روکیں گے، نہ ان کو ترک دین پر ورغلائیں گے اور نہ حضور کے تبلیغ و دعوت کے کام میں رخنہ انداز ہوں گے، لیکن انھوں نے اس راہ کو چھوڑ کر جنگ وجدال کی راہ اختیار کی اور اسلام دشمنی میں پہلے سے زیادہ سرگرم ہوگئے، اور دوسری جانب اس واقعہ کے سلسلہ میں مذکورہ بالا آیت قتال کے نزول نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثاروں کو اس بات کا یقین دلادیا کہ قریش سے اب خیر وصلاح کی کوئی توقع قائم نہیں کی جاسکتی، قرآن نے انھیں یاد دلایا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے انھیں ترک وطن پر مجبور کیا، یہ انھیں مسجد حرام سے روکتے رہیں گے، یہ اب تک مسلمانوں سے برسرپیکار رہے ہیں اور آیندہ بھی ایسے ہی رہیں گے، اس لئے اب بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ان سے جنگ کی جائے، اس کے بغیر فتنہ وفساد اور شر وعناد

کا سر قلم نہیں ہو سکتا، چنانچہ غزوۂ بدر اسی واقعۂ نخلہ کا نتیجہ ہے۔

غزوۂ بدر کا آغاز کیسے ہوا؟ جن ارباب علم و نظر کی نگاہ غزوۂ بدر کے ماخذ پر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس سلسلہ میں احادیث میں جو کچھ ہے وہ اصل واقعہ کی چند جز
کے بیان سے زیادہ نہیں ہے، اور اگرچہ قرآن مجید میں بھی اس غزوہ کا بیان جس تفصیل سے ہے، کسی اور غزوہ کا بیان اس تفصیل سے نہیں ہے، لیکن چونکہ قرآن کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے، اس بنا پر پورے واقعہ کا مربوط اور مسلسل بیان اس میں بھی نہیں ہے، اب رہیں کتب مغا وسیرت! تو ان میں بھی نفس واقعہ، اس کے اسباب اور اس کی جزئیات اس طرح ایک دو سے خلط ملط ہو گئے ہیں کہ تاریخ نویسی کے موجودہ مذاق کے مطابق واقعہ کی مختلف کڑیوں ک ایک دوسرے سے مربوط کرنا کارے دارد کا مصداق ہے، اردو زبان کے بلند پایہ سیرت نگ مولانا شبلیؒ اور مولانا عبد الرؤف داناپوریؒ دونوں نے واقعہ کی صورت ایک دوسرے سے مختلف لکھی ہے، اس کی بڑی وجہ یہی ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس سلسلہ میں جو کاوش کی ہے اس کا موضوع درحقیقت حضور کے میدانہائے جنگ کی جغرافیائی تحقیق ہے، اس کے سوا انھوں نے جو کچھ کہا ہے دوسروں پر اعتماد کر کے کہا ہے، ہم نے غزوۂ بدر کے تمام ماخذ کو سامنے رکھکر بہت کچھ غور و فکر کے بعد واقعہ کی اصل صورتِ حال اپنے ذہن میں جو کچھ متعین کی ہے اسے پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ ارباب علم و تحقیق اسے پسند کریں گ

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ نخلہ کا واقعہ کوئی الگ تھلگ اور منفرد واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہ غزوۂ بدر کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے، اس ذیل میں امورِ غور طلب یہ ہیں

(۱) سریۂ عبد اللہ بن جحش کس تاریخ کو روانہ ہوا۔

(۲) سریہ کو روانہ کرتے وقت وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے حضورؐ نے اس درج اہتمام فرمایا کہ امیر سریہ کو ایک بند تحریر دی اور تاکید فرمائی کہ جب تک تم دو دن کی مسافت طے نہ کر لو اسے مت کھولنا۔

(۳) پھر فرمایا کہ تحریر پڑھنے کے بعد جو شخص تمھارے ساتھ نہ جانا چاہے اسے مجبور نہ
...نا۔ اسے جانے دینا۔
(۴) نخلہ کا مقام وقوع کہاں ہے، اور مکہ سے اس کا فاصلہ کتنا ہے؟
یہ سوالات تو وہ ہیں جو سریۂ حضرت عبداللہ بن جحش کے بارہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اب
...ا قریش کا وہ کاروانِ تجارت جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آرہا ہے اس کے
...علق حسب ذیل امور پر غور کرنا چاہئے:
(۱) یہ قافلہ کس ساز و سامان اور تزک و احتشام سے روانہ ہوا تھا۔
(۲) مکہ سے کب روانہ ہوا تھا۔
(۳) مکہ اور شام کے درمیان مسافت کتنی ہے۔
اب اگر ان تمام امور اور تنقیحات پر یکجائی غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ چونکہ مکہ
...ر شام کے درمیان آٹھ سو نو سو میل کا فاصلہ ہے اور اس زمانہ میں کارواں جس رفتار سے
...تے تھے اس کے حساب سے اس مسافت کو طے کرنے کے لئے کم از کم ایک ماہ کی مدت درکار
...وتی ہے اور کارواں جس مقصد کے لئے گیا ہے وہ ایک دو دن کا کام نہیں، کم از کم ایک
...ہینہ شام میں اُس کا قیام بھی رہا ہوگا۔ اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ غزوۂ بدر کے سلسلہ میں آنحضرت
...لی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے علیٰ حسب روایات ۸ ریا ۱۲ ر رمضان ۲ھ کو روانہ ہوئے ہیں۔
...س بنا پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ قریش کا یہ کاروانِ تجارت اوائل رجب میں مکہ سے
...روانہ ہوا ہوگا۔
اب یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ کاروان کس ساز و سامان کے ساتھ روانہ ہو رہا ہے،
...بن سعد نے خود ابوسفیان، امیر کاروان کا قول نقل کیا ہے کہ مکہ میں کوئی صاحب
...یثیت شخص، مرد یا عورت ایسا نہیں تھا جس نے اس کاروان میں حصہ نہ لیا ہو
...ر اپنی رقم اس میں نہ لگائی ہو۔ ایک عام اندازہ کے مطابق کاروان کے پاس

بچاس ہزار دینار کا سامانِ تجارت تھا[۱]۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کا اندازہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار اشر
کا کیا ہے[۲]۔ جو لوگ اس کاروان میں شریک تھے ان کی تعداد کم و بیش ستر اور اونٹوں کی تعداد
ایک ہزار تھی، کارواں کا اس ساز و سامان اور تزک و احتشام کے ساتھ روانہ ہونا اور مکہ کے
ایک ایک مرد اور عورت کا جوش و خروش کے ساتھ اس میں حصہ لینا اس بات کی کھلی دلیل
ہے کہ یہ سب کچھ محض کاروباری اور تجارتی مقصد سے نہیں تھا، بلکہ اس عظیم جنگ کی تیاری
کے سلسلہ میں تھا جو قریش مدینہ پر حملہ کی شکل میں کرنا چاہتے تھے اور جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے
یہود مدینہ کے نام ایک خط میں ابوسفیان اس کی دھمکی بھی دے چکا تھا اور قبیلہ قبیلہ اس کا
پروپگنڈہ بھی ہو رہا تھا۔

جب مکہ کے حالات یہ ہوں تو ناممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اطلاع
نہ ہو اور آپ ان سرگرمیوں سے بے خبر ہوں، چنانچہ ہماری رائے میں آپ نے سریہ عبداللہ
بن جحش جو روانہ فرمایا ہے اس کی اصل محرک قریش کی یہی سرگرمیاں تھیں، ان سرگرمیوں
کے باعث اس وقت مکہ گویا دشمن کی جنگی تیاریوں کا ایک کیمپ بنا ہوا تھا اور چونکہ نخلہ
جہاں اس سریہ کو پہونچنا اور وہاں سے سراغرسانی کرنا تھا مکہ سے قریب صرف ایک شب
کی مسافت پر یعنی بارہ تیرہ میل تھا اس بنا پر یہاں آکر سراغرسانی کرنا جان جوکھم میں ڈالنے
کے مرادف اور سخت خطرناک کام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس
سریہ کے معاملہ میں بڑی رازداری سے کام لیا۔ امیر سریہ کو ایک بند تحریر دے کر فرمایا
کہ جب تک دو شب و روز کی مسافت طے نہ ہو جائے وہ ہرگز اس کو نہ پڑھیں۔ اور
پڑھنے کے بعد جو شخص بھی ہمراہ نہ ہونا چاہے اسے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کیا جائے، یہ رازداری

---

(1) Mohammad in Madina P. 10.

(۲) بحوالۂ ساحۃ الاسلام از ڈاکٹر احمد محمد الحوفی مطبوعۂ قاہرہ ص ۱۳۸

صرف اس لئے تھی کہ سریہ ایک نہایت خطرناک مہم پر جارہا تھا۔ اور مدینہ اور اس کے قرب و جوار میں برے بھلے، دوست دشمن ہر قسم کے لوگ تھے، اگر کسی منافق یا یہودی کو اس کی خبر ہوجاتی تو غضب ہوجاتا، اور سریہ کا بچ کر صحیح سلامت آنا مشکل ہوتا۔

مستشرقین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے انھوں نے لکھا ہے کہ سریۂ عبد اللہ بن جحش کا مقصد ہی قافلۂ قریش جو عمرو بن الحضرمی کی سرکردگی میں آرہا تھا اس کی گھات میں بیٹھنا تھا[۱]۔ حالانکہ حضورؐ نے جو الفاظ لکھے تھے وہ یہ تھے: "فترصد بہا قریشاً وتعلم لنا من اخبارھم" ان الفاظ کا صاف ترجمہ یہ ہے کہ "تم نخلہ میں قریش کی ٹوہ لگاؤ اور ان کے حالات معلوم کرکے ہمیں بتاؤ[۲]"۔ واٹ منٹگری (Watt Montgomary) جو سنجیدہ نگاری کے لئے اپنی جماعت میں مشہور ہے لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل پیغام "فترصد بہا قریشاً" تھا اور "وتعلم لنا من اخبارھم" صاف طور پر اس پر اضافہ ہے جو بعد میں اس غرض سے کیا گیا ہے کہ "ترصد" کے معنی "گھات میں بیٹھو" نہ ہوں، بلکہ "ان کے حالات کی نگرانی کرو" ہوجائیں۔ لیکن اس کی دلیل کیا ہے کہ یہ الفاظ اضافہ ہیں؟ اس کا جواب ندارد، اس دھاندلی کا کچھ ٹھکانا ہے!

پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اگر بات صرف اتنی ہی تھی کہ عمرو بن الحضرمی کے کاروان سے تعرض کرنا تھا جو چار آدمیوں پر مشتمل تھا تو سریۂ عبد اللہ بن جحش جو ایک روایت کے مطابق بارہ اور ایک روایت کی رو سے آٹھ افراد پر شامل تھا اس کے لئے یہ ایسا کونسا مشکل اور خطرناک کام

---

(1) Mohammad in Madina P. 7.

(۲) اس سریہ کا ذکر ابن ہشام، ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، طبری، ابن حزم، ابن کثیر اور ابن عبد البر ہر ایک نے کیا ہے اور یہ الفاظ ابن اسحٰق کے تتبع میں جو سیرت اور مغازی کے باوا آدم ہیں اکثر نے نقل کئے ہیں۔

تھا جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درجہ رازداری سے کام لیا اور ایک بند تحریر کے ذریعہ امیر سریہ کو وہ ہدایات دیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، علاوہ ازیں اگر معاملہ یہی تھا تو اس پر اتنا بڑا ہنگامہ کیوں برپا ہوا کہ ایک طرف سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اظہار ناپسندیدگی فرمایا اور ارشاد ہوا کہ "میں نے تم کو جنگ کرنے کی اجازت تھوڑی دی تھی" اور ساتھ ہی مال غنیمت میں اپنا حصہ لینا منظور نہیں کیا دوسری جانب صحابہ نے عبد اللہ بن جحش کو اس قدر برا بھلا کہا کر روایت میں "وسقط فی القوم" یعنی "لوگوں کی نظروں سے گر گئے" کے الفاظ مذکور ہیں۔ مزید برآں منافقین، یہود اور مشرکین اور خود مسلمانوں میں بھی شور مچ گیا کہ ماہ مقدس کی بیحرمتی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن کو درمیان میں آکر صفائی پیش کرنی پڑی۔

بہرحال ان وجوہ بالا کی بنا پر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سریۂ عبد اللہ بن جحش مکہ سے جو کاروان قریش شام جارہا تھا اور اس سلسلہ میں وہاں جو اور سرگرمیاں اور سرگوشیاں ہورہی تھیں ان کی ٹوہ لینے کے لئے ہی بھیجا تھا۔ یہ بالکل ایک اتفاقی حادثہ تھا کہ سریہ کی مڈبھیڑ عمرو بن الحضرمی کے مختصر سے قافلہ سے ہوگئی اور سریہ اس میں الجھ کر رہ گیا۔ اور یوں بھی سریہ جب نخلہ پہونچا ہے یہ ماہ رجب کی آخری تاریخیں تھیں، اس بنا پر قیاس یہی ہے کہ کاروان قریش مکہ سے نکل چکا اور شام کے راستہ پر گامزن ہوگا۔

قریش کے آئندہ کے لیے جو عزائم اور منصوبے تھے وہ ظاہر ہیں ہی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اب تک وقتاً فوقتاً ان لوگوں کے کاروانوں کی جستجو میں جوگشتی دستے بھیجتے رہے تھے اور بعض میں آپ خود بھی گئے تھے اُن کا اِن لوگوں کو علم تھا اور ان کی وجہ سے یہ پہلے ہی سے چوکنا تھے، اب اِدھر عمرو بن الحضرمی کے قتل اور اس کے کاروان کی بربادی کی اطلاع شام میں ابوسفیان اور دوسرے ارکانِ کاروان کو ہوئی تو ان کو دن میں تارے نظر آنے لگے اور انھیں محسوس ہوا کہ اب واپسی میں کاروان تجارت کی خیر نہیں ہے، غلبۂ دہشت وخوف کے باعث بدحواسی کے عالم میں

ابوسفیان نے ایک شخص کو جس کا نام ضمضم الغفاری تھا مکہ روانہ کر دیا۔ شدید خوف اور دہشت کے موقع پر عرب کے قاعدہ کے مطابق اس شخص نے اپنے اونٹ کی ناک کاٹی، اپنا کرتا پھاڑا اور زور زور سے چیخنا شروع کیا: "اللطیمۃ، اللطیمہ" جس کے معنی یہ ہیں کہ "اے لوگو تمہارے اونٹ جو سامان تجارت لادے ہوئے ہیں ان کو حملہ سے بچاؤ" ضمضم کی اس چیخ پکار نے مکہ میں آگ لگادی اور قریش کا ایک ایک فرد اس مہم کو سر کرنے کے جوش میں آپے سے باہر ہوگیا، جن لوگوں کے پاس مال اور ہتیار نہیں تھے ان کو سہیل بن عمرو نے جو بڑا دولتمند تاجر تھا، یہ سب چیزیں مہیا کیں۔

مکہ میں جو جنگ کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہوئیں ان کا ہیرو ابوجہل عمر بن ہشام مخزومی تھا۔ یہ طاقت اور گھمنڈ کے نشۂ پندار میں اس درجہ بدمست ہو رہا تھا کہ اگرچہ ابوسفیان اپنے کاروان کو سمندر کے ساحل ساحل، مدینہ کے راستہ سے کترا کر مسلمانوں کے خطرہ سے بچا نکالنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور اس لئے مکہ میں کہلا بھیجا تھا کہ اب فوج کشی اور لشکر آرائی کی ضرورت نہیں ہے، لیکن ابوجہل نہ مانا اور بنکار کے بولا: "نہیں ہم ضرور بدر جائیں گے، وہاں تین دن تک خوب ضیافتیں ہوں گی، رنگ رلیاں منائیں گے، شرابیں اڑیں گی اور رقص و سرود کے جلسے ہوں گے" یہ زمانہ بدر میں سالانہ میلہ (Annual Fair) کا بھی تھا۔ مقصد یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مدینہ کے لوگوں پر قریش کی سطوت و طاقت اور ان کی جی داری کی دھاک بیٹھ جائے، ابوجہل کی اس خرمستی کا ذکر مسلمان مورخینِ سیرت نے تو کیا ہی ہے، مستشرقین میں پروفیسر واٹ منٹگمری نے بھی اپنی کتاب (Mohammad at Madina) میں اور پھر اپنے مقالہ مطبوعۂ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (جدید اڈیشن) میں لفظ بدر کے ماتحت دونوں جگہ اس کا خاص طور پر نوٹس لیا ہے، غزوۂ بدر کے سلسلہ میں قرآن مجید کی آیتِ ذیل ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کی ان عاقبت نااندیشانہ بالاخوانیوں کی ہی عکاسی کرتی ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم	اور دیکھنا تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے
بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ، وَيَصُدُّونَ عَن	گھروں سے اکڑفوں کے ساتھ اور لوگوں کے دکھاوے

سَبِيْلِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ (الانفال)

کے لئے نکلے ہیں اور راہِ حق سے لوگوں کو روکتے ہیں، اچھا خیر! اللہ کے علم میں تو ان سارے لوگوں کے کچھن ہیں۔

دو سوال

اب ذرا ٹھہریے، آگے بڑھنے سے پہلے دو سوالوں کا جواب ضروری ہے جو یہاں پیدا ہوتے ہیں:

(۱) ایک یہ کہ ابوسفیان نے ضمضم بن عمرو الغفاری کو جو مکہ بھیجا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ سے روانہ ہونے سے پہلے بھیجا تھا یا بعد میں؟

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے روانہ ہوئے ہیں اس وقت لشکرِ قریش مکہ سے روانہ ہو چکا تھا یا نہیں؟

پہلے سوال کے جواب میں اربابِ سیر و مغازی (ابن اسحٰق سے ابن عبدالبر تک) عام طور پر لکھتے ہیں کہ "جب ابوسفیان کو یہ خبر پہونچی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے کاروانِ تجارت کی جستجو میں مدینہ سے چل پڑے ہیں تو اس نے ضمضم کو اجرت پر لیا اور مکہ روانہ کیا، لیکن در حقیقت یہ بالکل غلط اور خلافِ واقعہ بیان ہے، کیونکہ انھیں اربابِ سیر کے بیان کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۸ رمضان اور ابن سعد کے بیان کے مطابق ۱۲ رمضان کو مدینہ سے روانہ ہوئے ہیں، اور غزوۂ بدر ۱۷، ۱۹ یا ۲۱ رمضان (مطابق ۱۳، ۱۵ یا ۱۷ مارچ ۶۲۴ء) کو برپا ہوا ہے۔ اس حساب سے مدینہ سے باہر نکلنے اور غزوہ کے شروع ہو جانے میں اوسطاً چھ سات دن یعنی صرف ایک ہفتہ کا فصل ہوا۔ اب اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ابوسفیان نے حضور کے مدینہ سے نکلنے کے بعد ضمضم کو مکہ دوڑایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس وقت ابوسفیان مقام بدر سے کافی پیچھے تھا اور ضمضم کی روانگی یقیناً جلد سے جلد ۱۰ رمضان یا ۱۴، ۱۵ رمضان کو ہی ہو سکتی ہے، ساتھ ہی یہ پیش نظر رکھئے کہ ابوسفیان اس وقت جس مقام پر ہے وہاں سے مکہ تک کی اور پھر مکہ سے بدر تک

کی (جہاں لشکر قریش سے سابقہ ہوا) یہ سب مسافت کتنی ہے[1]؟ اور پھر ضمضم کے مکہ پہونچتے ہی تو فوراً لشکر قریش روانہ نہ ہوگیا ہوگا۔ بلکہ تیاری میں کم ازکم دو تین دن ضرور لگے ہوں گے، ان سب چیزوں کو سامنے رکھا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ضمضم کی روانگی اور بدر میں لشکر قریش کی آمد کے درمیان کم ازکم بارہ تیرہ دن کا فاصلہ ہونا چاہیئے۔ حالانکہ ضمضم کی روانگی کے چار پانچ دن بعد ہی جنگ شروع ہوگئی ہے، اس سے صاف طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابوسفیان نے ضمضم کو اس وقت مکہ بھیجا تھا جب کہ حضور ابھی مدینہ سے روانہ بھی نہیں ہوئے، چنانچہ ہم نے اوپر جو حساب لگایا ہے اسی کی بنیاد پر پروفیسر منٹگری لکھتے ہیں: "بعض مآخذ بتاتے ہیں کہ ابوسفیان نے اپنا قاصد مکہ اس وقت بھیجا تھا جب اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تیاریوں کی اطلاع ہوئی تھی، لیکن اوقات اور دنوں کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بالکل ناممکن نظر آتا ہے[2]۔"

اب رہا دوسرا سوال جو پہلے سوال کا ہی ایک جز اور شاخسانہ ہے اس کا صاف اور قطعی جواب یہ ہے کہ لشکر قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ سے روانگی سے پہلے نہ صرف یہ کہ مکہ سے چل پڑا تھا، بلکہ بدر میں لشکر اسلام سے قبل پہونچ چکا تھا۔ چنانچہ اثنائے راہ میں جب اس لشکر کو ابوسفیان کا پیغام ملا ہے تو ابوجہل نے "واللہ مانرجع" یعنی بخدا! ہم واپس نہیں ہوں گے" کے الفاظ کہے ہیں، علاوہ ازیں ایک واضح اور صاف روایت یہ ہے کہ جب حضور چلتے چلتے بدر کے قریب خیمہ نگن ہوئے تو شام کے وقت حضرت علی، حضرت زبیر اور حضرت سعد بن

---

[1] بدر مدینہ کے جنوب میں واقع ہے اور مدینہ سے اس کی مسافت ایک سو ساٹھ (160) میل ہے، اور دوسری جانب بدر جو مکہ کے شمال میں ہے اس کی مسافت مکہ سے دو سو پچاس (250) میل ہے، یہ مسافت ان راستوں کے اعتبار سے ہے جن پر پہلے زمانہ میں قافلے چلتے تھے

[2] Mohammad at Madina: P. 10.

ابی وقاص کو دشمن کی خیر خبر لینے کے لئے روانہ کیا، ان حضرات کو قریش کا ایک اونٹ ملا جو پانی سے لدا ہوا تھا، اس اونٹ کے ساتھ اسلم اور ابو یسار دو غلام تھے، صحابہ نے ان کو پکڑ لیا اور اپنے خیمہ میں لے آئے، حضور اس وقت نماز پڑھ رہے تھے، اب صحابہ نے دونوں غلاموں سے پوچھا: "تم کون ہو؟" انھوں نے جواب دیا: "ہم قریش کے بہشتی ہیں" بہشتی لشکر کے ساتھ ہوتے تھے، نہ کہ تجارتی قافلہ کے ساتھ، صحابہ نے خیال کیا کہ جھوٹ بول رہا ہے اس لئے اسے مارنا شروع کر دیا، اب ان کو چوٹ لگی تو بولے: نہیں ہم کاروان قریش کے لوگ ہیں، اتنے میں حضورؐ نماز سے فارغ ہو گئے تھے، آپ نے صحابہ سے فرمایا: ان غلاموں نے تم سے سچ بات کہی تو تم نے اسے پیٹنا شروع کر دیا، پھر یہ جھوٹ بولا تو تم نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد حضورؐ نے غلاموں سے دریافت کیا کہ لشکر قریش کہاں ہے؟ یہ بولے: "ٹیلہ کے پیچھے" آپ نے مزید دریافت کیا کہ "یہ لوگ کتنے اونٹ روزانہ ذبح کرتے ہیں" انھوں نے کہا: دس اونٹ روزانہ، ایک اونٹ چونکہ کم وبیش سو آدمیوں کو کافی ہوتا ہے، اس لئے حضورؐ نے اس سے اندازہ لگایا کہ لشکر کی تعداد نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہوگی[۱]

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ:

(الف) ابو سفیان نے ضمضم کو مکہ اس وقت بھیجا ہے جب کہ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے روانہ نہیں ہوئے ہیں۔

(ب) ضمضم کی چیخ پکار پر مکہ میں جنگ کی تیاریاں اس وقت شروع ہوئی ہیں جب کہ مدینہ میں ابھی جنگ کا سان گمان بھی نہیں ہے، اور اس بنا پر ابو جہل ایک لشکر جرار لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ سے روانگی سے پہلے ہی مکہ سے چل پڑا ہے۔

---

[۱] الدرر لابن عبد البر ص ۱۱۲

اہل خرد کی واماندگی

لیکن سلسلۂ واقعات میں ارباب سیر نے جو روایات نقل کی ہیں وہ اس درجہ پُر پیچ وخم ہیں کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ جیسا محقق بھی ان میں الجھ کر رہ گیا اور ان سے دامن نہیں بچا سکا ہے، چنانچہ اس موقع پر (عہد نبوی کے میدان جنگ) میں لکھتے ہیں:

"قافلہ سالار (ابوسفیان) کا پیام مکہ پہونچا تو وہاں لازمی طور پر کہرام مچ گیا، کیونکہ ہر ایک گھرانے کا کچھ نہ کچھ سامان اس (کاروانِ ابوسفیان) میں تھا۔ جلدی میں قریش نے ناکافی تیاری کی اور جملہ حلیفوں کے اکٹھے ہونے کا انتظار نہ کیا۔ خاص طور پر جنگجو احابیش کو ساتھ نہ لینے پر بعد میں وہ بہت پچھتاتے بھی رہے، پھر بھی ہزار کے قریب رضاکار جمع ہوگئے، جن میں سے بعض کے پاس گھوڑے بھی تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے عام روایات کے دباؤ میں یہ لکھ تو دیا، لیکن انھیں اس کا احساس ہے کہ ان روایتوں پر بھروسا کرنے سے کیسی کچھ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، چنانچہ اس کے بعد ہی رقمطراز ہیں:

"اس کمک (لشکر ابوجہل) کو مکہ سے بدر پہونچنے میں کم وبیش ایک ہفتہ ضرور لگا ہوگا۔ یہ سوال کافی پیچیدہ ہے کہ قافلہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کیوں فوراً مدینہ واپس نہیں ہوگئے اور کیوں ہفتہ بھر بدر میں پڑاؤ ڈالے، اپنے مرکز سے دور، خطرہ کا سامنا کرتے مقیم رہے۔

پھر خود ہی اس کافی پیچیدہ سوال کا جواب دیتے ہیں:

"جہاں تک غور کیا مجھے ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے، ہجرت کے ساتھ ہی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آس پاس کے قبائل سے حلیفی اور معاونت کے معاہدے کرنے شروع کر دیے تھے چنانچہ ۱ھ میں جہینہ کے بعض سرداروں سے معاہدہ ہوا تھا" الخ

لیکن تاریخی حیثیت سے اس جواب کا کیا پایہ ہے؟ اس کے متعلق ہم بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ جواب

ڈاکٹر صاحب جیسے فاضل اور صاحب نظر مصنف کے مرتبہ سے نہایت فروتر اور لائق افسوس ہے۔[1]

---

[1] تاریخ اسلام میں روایات کا یہی وہ جھول ہے جس کی وجہ سے نہایت غائر نظر سے ان کے تنقیدی مطالعہ کی بہت سخت ضرورت ہے، اسی ضرورت کے پیش نظر عرصہ ہوا راقم الحروف نے "اسلام کے عہد اولین کے مورخ اور ان کی تاریخ نویسی" پر ایک سلسلۂ مقالات لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور اس پر کچھ مواد جمع کر بھی لیا تھا، لیکن افسوس ہے بعض اور دوسرے منصوبوں کی طرح یہ منصوبہ بھی پریشان خاطری اور پراگندہ دماغی کی نذر ہو گیا،

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بہرحال غزوۂ بدر کی بحث کے خاتمہ پر اس سلسلہ کی روایات کے پیچ وخم پر مختصر گفتگو ہم اس مقالہ میں بھی کریں گے، وباللہ التوفیق

عہدِ نبوی کے غزوات وسرایا
اور
ان کے مآخذ پر ایک نظر

(۷)

سعید احمد اکبر آبادی

مدینہ میں تیاریاں

مدینہ میں عام چرچا تھا کہ ابوسفیان کا تجارتی قافلہ بڑے ساز و سامان اور تزک و احتشام کے ساتھ شام سے واپس آرہا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعین پالسی کے مطابق یہ طے تھا کہ قافلہ مدینہ کی راہ سے گذرے گا تو آپ صحابۂ کرام کے ایک دستہ کے ساتھ مدینہ سے نکل کر مقام بدر پر اس قافلہ سے تعرض کریں گے لیکن قدرت کو منظور کچھ اور ہی تھا، چنانچہ یہاں یہ سب تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع پہونچی کہ ابوجہل ایک لشکر جرار لے کر روانہ ہو چکا ہے تو آپ نے یہ خبر اپنے ساتھیوں کو سنائی اور ان سے مشورہ کیا، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے یکے بعد دیگرے کھڑے ہوئے اور پر زور تقریر کی، لیکن آپ انصار کی رائے معلوم کرنا چاہتے تھے، کیونکہ انصار سے معاہدہ یہ تھا کہ دشمن مدینہ پر حملہ کرے گا تو انصار مدد کریں گے اور یہاں ظاہر ہے اب تک کوئی ایسی صورت نہیں تھی، اس بنا پر حضور نے مجلس مشاورت دراز کردی اور منتظر رہے کہ دیکھیں انصار کیا کہتے ہیں۔ انصار نے اس بات کو محسوس کرلیا تو حضرت سعد بن معاذ ان کے نمائندہ

کی حیثیت سے کھڑے ہوئے اور بڑے جوش میں بولے : یارسول اللہ! اگر آپ ہم کو حکم دیں کہ اس سمندر میں کود پڑو تو ہم اس میں بے تکلف چھلانگ لگادیں گے، حضرت المقداد بن عمرو نے مہاجرین کی طرف سے نہایت ولولہ انگیز تقریر کی اور کہا: "اے اللہ کے رسولؐ! آپ کو اللہ نے جو راہ دکھائی ہے اُس پر چل پڑیئے، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں، خدا کی قسم! ہم وہ نہیں کہیں گے جو بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ "آپ اور آپ کا خدا، دونوں جائیے اور جنگ کیجئے، ہم تو یہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔" ان تقریروں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک خوشی سے چمک اٹھا اور فرمایا "اچھا تو چلو، اور یہ خوش خبری سنو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے قریش کے دو طائفوں (عیر اور نفیر) میں سے ایک کا وعدہ کرلیا ہے[1]۔" بعض صحابہ جنھوں نے کسی وجہ سے عذر کیا آپ نے ان پر جبر نہیں کیا، اس وقت آپ کے ساتھ کل ۳۱۷ جاں نثاروں کا مجمع تھا جن میں سے دوسو اکتیس (۲۳۱) انصار تھے، ایک سو ستر (۱۷۰) خزرج سے اور اکسٹھ (۶۱) اوس قبیلہ سے، اور باقی چھیاسی (۸۶) کی تعداد میں مہاجر تھے، لیکن اس تعداد میں بھی قریشی صرف اکتالیس (۴۱) تھے، باقی جتنے بھی تھے وہ موالی اور حلفاء میں سے تھے۔

ضروری انتظامات مدینہ سے روانہ ہونے کا وقت قریب آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں امامت صلوٰۃ کی خدمت حضرت عبداللہ بن مکتوم کے سپرد کی، لشکر کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم کیا۔ اول الذکر کی قیادت حضرت علی کے سپرد ہوئی اور موخر الذکر کے قائد حضرت سعد بن معاذ بنائے گئے، دونوں کا عَلَم جو سیاہ رنگ کا تھا الگ الگ تھا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پورے لشکر کے قائد عام تھے اور آپ کا علم سفید تھا۔ لیکن اس وقت آپ نے یہ عَلَم حضرت مصعب بن عمیر کو جو قریشی تھے عطا فرمایا۔ پھر

---

[1] الدرر لابن عبدالبر ص ۱۱۱

آپ نے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر کے میمنہ کی قیادت حضرت زبیر بن عوام کو اور میسرہ کی سربراہی حضرت مقداد بن عمرو الکندی کو کہ دونوں بہترین شہسوار تھے تفویض کی۔ اور ساقہ یعنی پچھلا دستہ جسے انگریزی میں Rearguard کہتے ہیں اس کے قائد حضرت قیس بن ابی صعصعہ بنائے گئے، ساز و سامان کا یہ عالم تھا کہ پوری فوج کے پاس لے دے کے کل ستّر اونٹ اور دو گھوڑے تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک اونٹ میں کئی کئی افراد کو شریک کر دیا کہ وہ باری باری سے اس پر سوار ہوتے تھے، ایک اونٹ میں خود حضور کے ساتھ حضرت علی اور حضرت مرثد بن ابی مرثد شریک ہو گئے، ان دونوں نے اپنی اپنی باری بھی حضور کو پیش کی تو آپ نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا: تم دونوں مجھ سے زیادہ طاقتور نہیں ہو اور میں اجر و ثواب کے معاملہ میں تم سے زیادہ بے نیاز نہیں ہوں، پھر ارشاد ہوا کہ ایک اونٹ میں بس میرا حصہ وہی ہوگا جو تم میں سے کسی ایک کا ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید انتظام یہ کیا کہ اونٹوں کی گردنوں میں جو گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں وہ سب دور کرا دیں تاکہ لشکر کی نقل و حرکت پوشیدہ رہے۔

اب یہ لشکر روانہ ہوا تو عام قاعدہ کے مطابق دشمن کی فوج کی نقل و حرکت اور اس کے حالات کا کھوج لگانے کی غرض سے چند آدمیوں کا دستہ آگے روانہ کر دیا گیا جس میں بسبس بن عمرو الجہنی اور عدی بن ابی الزغباء شامل تھے، مدینہ سے روانہ ہو کر پہاڑ کی گھاٹیوں میں سے گذرتے ہوئے جب یہ لشکر مقام الروحاء پر پہونچا جو مدینہ سے تین میل کی مسافت پر ہے تو یہاں آپ نے حضرت ابو لبابہ کو مدینہ کی امارت پر مامور فرمایا اور انھیں اس مقام سے واپس کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر پہونچنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا اصحاب مغازی و سیر اس کی درمیانی منزلوں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن یہ نا تمام ہے، عہد حاضر کے مشہور فاضل

محمد احمد باشمیل نے اپنی کتاب "غزوۃ بدر الکبریٰ" میں اپنے ذاتی مشاہدہ اور تحقیق کے بعد اس راستہ کا تذکرہ مفصل طور پر کیا ہے اس لئے ہم ذیل میں اسے نقل کرتے ہیں:

"مدینہ سے بدر کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ راستہ اختیار فرمایا کہ مدینہ کے قریب جو ایک پہاڑ ہے آپ اس کے دروں میں گھس گئے اسے عبور کر کے آپ وادی عقیق میں پہونچے، پھر علی الترتیب ذوالحلیفہ، اولات الجیش، تربان، ملل[1]، غمیس الحمام، صخیرات الیمامہ، السیالہ، فج الروحاء اور پھر شنوکہ[2] سے گذرے، بئر الروحاء سے نکلتے وقت آپ نے مکہ کا راستہ اپنی بائیں جانب چھوڑ دیا تھا۔ پھر بدر کے ارادہ سے آپ نازیہ پر دائیں طرف مڑ گئے، یہاں تک کہ جب آپ نے ایک وادی جس کا نام رحقان ہے اور جو نازیہ اور تنگنائے صفراء کے درمیان واقع ہے طے کر لی تو آپ اس سے اتر آئے، پھر وادی الصفراء کو اپنے بائیں جانب چھوڑا۔ اور دائیں طرف چلتے ہوئے ایک وادی میں پہونچے جس کا نام ذفران ہے، یہی وہ وادی ہے جہاں کتب مغازی وسیر کی عام روایات کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لشکر قریش کے چل پڑنے اور بدر کی طرف رخ کرنے کی اطلاع ملی تھی، وادی ذفران سے نکلنے کے بعد آپ گھاٹیوں کی طرف چل دیے جن کا نام الاصافر ہے۔ ان گھاٹیوں سے اتر کر آپ ایک آبادی میں آئے جو بدر کے قریب ہے اور جس کا نام الدبہ ہے، اور الحنان جو ایک بڑا ٹیلہ ہے اسے دائیں جانب چھوڑ دیا۔ الدبہ سے روانہ ہو کر آپ بدر کے قریب فروکش ہوئے۔

یہاں وہ واقعہ پیش آیا جسے ہم الدرر لابن عبدالبر کے حوالہ سے نقل کر چکے ہیں لیکن یہ واقعہ صحیح مسلم جلد ثانی باب غزوۂ بدر اور البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۶۵ میں بھی موجود

---

[1] یہ مدینہ سے قافلہ کے لئے دو راتوں کے فاصلہ پر ہے۔

[2] بدر کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے۔

ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ بدر میں فروکش ہوئے تو آپ کے پاس سے قریش کی آب بردار سواریاں (روایا قریش) گذریں ان میں بنو الحجاج کا ایک سیاہ فام غلام بھی تھا، صحابہ نے اس کو پکڑ لیا اور اس سے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کا اتا پتہ دریافت کرنے لگے، غلام نے کہا: مجھے ابوسفیان وغیرہ کا علم تو نہیں ہے، البتہ ابوجہل، عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف تو یہیں پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد واقعہ کا بقیہ جزو وہی ہے جسے ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔

یہ واقعہ تو شام کے وقت کا تھا۔ اس سے پہلے یہ واقعہ پیش آچکا تھا کہ جائے قیام پر پہونچنے کے بعد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک ساتھی کو لے کر لشکر قریش کی فرودگاہ کا سراغ لینے کے لئے روانہ ہوئے تھے، اثنائے راہ میں آپ کو ایک سن رسیدہ عرب ملا۔ آپ نے اس خیال سے کہ اس شخص کو جاسوسی کا شبہ نہ ہو لشکر قریش کے ساتھ لشکر اسلام کا بھی نام لیا اور دریافت کیا کہ یہ دونوں لشکر کہاں ہیں؟ یہ شخص بھی گرگ باراں دیدہ تھا، بولا: "پہلے تم دونوں بتاؤ کہ کون ہو؟ تب میں بتاؤں گا" حضور نے جواب دیا: "پہلے تم بتاؤ تو ہم بتائیں گے"۔ بوڑھے نے کہا: بات پکی ہے؟ حضور نے فرمایا: "بالکل!" اب یہ شخص بولا: "مجھے خبر ملی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھی فلاں روز مدینہ سے روانہ ہوئے ہیں، اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو میں کہتا ہوں کہ اب یہ حضرات فلاں مقام پر ہوں گے، اسی طرح مجھے معلوم ہوا ہے کہ لشکر قریش فلاں روز مکہ سے چلا ہے، اگر یہ خبر درست ہے تو میں کہتا ہوں کہ اب یہ لشکر فلاں مقام پر ہو گا"۔ جب یہ شخص اپنی بات کہہ چکا تو اس نے پوچھا کہ اب بتاؤ تم دونوں کون ہو؟ حضور نے جواب دیا: ہم ایک گھاٹ کے رہنے والے ہیں "نحن من ماءٍ" اس طرح حضور نے متعین طور پر یہ معلوم کر لیا کہ اس وقت لشکر قریش کا پڑاؤ کہاں ہے، اور آپ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

اس مقام پر ایک مرتبہ پھر اپنے ذہن میں یہ بات اجاگر کر لیجئے کہ مدینہ سے لشکر اسلام

کی روانگی کی تاریخ میں اختلاف ہے، عام ارباب مغازی وسیر کے نزدیک یہ روانگی ۸ رمضان المبارک (۲ھ) کو ہوئی تھی، لیکن ابن سعد نے ۱۲ تاریخ لکھی ہے، اور ہمارے نزدیک صحیح یہی ہے، کیونکہ مدینہ اور بدر کے درمیان قافلوں کی راہ سے ایک سو ساٹھ میل کی مسافت ہے، یہ مسافت حضورؐ نے کتنے دنوں میں طے کی ہوگی؟ اس کا حساب اس سے لگائیے کہ مکہ اور بدر کی درمیانی مسافت دوسو پچاس (۲۵۰) میل ہے، ان دونوں مسافتوں کا مجموعہ چارسو دس (۴۱۰) میل ہوا۔ اور یہ معلوم ہے کہ ہجرت کے وقت حضورؐ نے یہ مسافت نو (۹) دن میں طے کی ہے کیونکہ ارباب روایات کے عام بیان کے مطابق حضورؐ مکہ سے یکم ربیع الاول کو روانہ ہوئے تھے اور ۱۲ ربیع الاول کو قبا میں داخل ہو گئے تھے (اگرچہ مولانا شبلی نے بڑے دعوے کے ساتھ یہ تاریخ ۸ ربیع الاول لکھی ہے) اب ان دنوں میں سے تین دن وہ منہا کر دیجئے جو آپ نے غارِ ثور میں بسر کئے، اس طرح سفر کے دن نو (۹) ہوتے ہیں۔ اب نو پر چارسو دس (۴۱۰) کو تقسیم کیجئے تو کسر کو نظر انداز کر کے پینتالیس (۴۵) میل فی یوم کی مسافت بنتی ہے، اس سے قیاس کیجئے کہ قطع مسافت کی اس رفتار کے مطابق ......

.... مدینہ سے بدر کی مسافت جو ایک سو ساٹھ میل وہ حضورؐ نے، علی الخصوص جب کہ آپ جلدی کے باعث تیز رفتاری سے چلے ہوں گے، کتنے دن میں قطع کی ہوگی؟ مذکورہ بالا حساب سے یہ مسافت زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین دنوں میں طے ہو جانی چاہیئے اور چونکہ غزوۂ بدر ۱۷ رمضان کو شروع ہوا ہے، اس بنا پر یہ صاف ظاہر ہے کہ ابن سعد کے بیان کے مطابق حضور ۸ کو نہیں ۱۲ کو مدینہ سے روانہ ہوئے ہیں اور کم از کم غزوہ سے دو دن پہلے آپ بدر پہونچ گئے ہیں اور چونکہ مذکورہ بالا دو روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضور جب بدر کے قریب پہونچے ہیں اس وقت آپ کو معلوم ہوا کہ لشکر قریش پہلے سے وہاں پہونچ چکا ہے اور آپ کی جائے قیام سے ایک ٹیلہ کے دامن میں موجودہ نقشوں کے مطابق پانچ چھ کیلومیٹر کے فاصلہ پر مقیم ہے۔ اس بنا پر یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حضور جس روز مدینہ

سے روانہ ہوئے ہیں اس سے کم از کم دو دن پہلے لشکر قریش مکہ سے روانہ ہو چکا تھا۔

اب غور کرنا چاہیئے کہ حضور جو قریش کی ایک ایک نقل وحرکت پر کڑی نگاہ رکھتے تھے اور اس سلسلے میں آپ کے جاسوسی دستے ادھر ادھر برابر گھومتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں مکہ سے متصل رہنے والے جن قبائل سے آپ کا معاہدہ ہو چکا تھا ان سے بھی قریش کی نقل وحرکت کا سراغ ملنے میں مدد ملتی ہوگی تو کیا یہ ممکن ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود اس طمطراق اور شان وشوکت کے ساتھ لشکر قریش کی مکہ سے روانگی کا آپ کو علم نہ ہو، عقل ودرایت کا فیصلہ ہے کہ آپ کو مدینہ میں ہی لشکر قریش کی روانگی کا علم ہو گیا تھا۔ اور اسی لیئے آپ مدینہ سے ایک لشکر کی صورت میں جنگ کے لئے آمادہ ہو کر نکلے تھے۔

تین قافلے

لیکن اس وقت صورتِ حال بڑی عجیب وغریب تھی اور خدائے احکم الحاکمین نے اپنے حبیب کو ایک عظیم ابتلا وآزمائش سے دوچار کر دیا تھا، ایک طرف ابوسفیان کا کارواں تھا جو نہایت بیش قیمت ساز وسامان سے لدا پھندا شام سے دراونہ واپس آرہا تھا اور منزل بہ منزل مارتا ہوا آگے بڑھتا جارہا تھا۔ دوسری طرف لشکر قریش تھا جو بڑے حوصلوں اور ارمانوں کے ساتھ مکہ سے روانہ ہو کر مدینہ کے راستہ پر گامزن تھا، اور تیسری جانب یہ لشکر اسلام تھا جسے اس کا تو علم تھا کہ یہ دونوں قافلے ایک اوس کے پیچھے اور دوسرا اوس کے آگے حرکت کر رہے ہیں لیکن ان قافلوں کی صحیح پوزیشن نہ معلوم ہونے کے باعث اس کا علم نہ تھا کہ اس کا سابقہ سب سے پہلے کس سے ہوگا۔ بہرحال سابقہ کسی سے بھی ہو، مدینہ سے یہ لشکر اس سے عہدہ برآ ہونے کا عزم لے کر روانہ ہوا تھا۔

لیکن افسوس ہے کہ ایک طرف اربابِ روایات کی کوتاہ بینی کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے سارا زور کاروان ابوسفیان پر لگا دیا اور اسی کو آنحضرت صلی اللہ کے خروج عن المدینہ کا مقصد قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں لشکر قریش کا ذکر آتا بھی ہے تو ثانوی حیثیت

سے آتا ہے، اور دوسری جانب مولانا شبلی نے اگرچہ بڑی محققانہ اور فاضلانہ گفتگو کی ہے لیکن کاروانِ ابوسفیان سے انھیں ایسی چڑ ہے کہ اس کا نام لینا تک انھیں گوارا نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک اصحابِ سیر ومغازی اور مولانا شبلی دونوں انتہا پسندوں میں ہیں اور حق بات وہی ہے جو ہم نے لکھی ہے، اس معاملہ میں قرآن مجید سے بڑھکر اور کوئی حکم نہیں ہوسکتا۔ ارشاد ہے:

كما اخرجك ربك من بيتك بالحق، وان فريقاً من المومنين لكارهون، يجادلونك في الحق بعد ما تبين كانما يساقون الى الموت وهم ينظرون

جیسا کہ اے پیغمبر آپ کا رب آپ کو حق کے ساتھ آپ کے گھر سے نکال لایا، حالانکہ مومنوں کا ایک طبقہ اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ حق کے ظاہر ہوجانے کے بعد بھی یہ لوگ آپ سے جھگڑتے تھے، گویا کہ یہ لوگ موت کی طرف لے جائے جارہے تھے اور انھیں موت سامنے نظر آرہی تھی۔

اس آیت سے بنص صریح یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور کا خروج عن المدینہ کسی ایسے مقصد کے لئے ہے جس میں جان کا خطرہ ہے، اور یہ لشکر قریش سے مقابلہ کی صورت میں ہی ہوسکتا تھا، نہ کہ کاروانِ ابوسفیان کی صورت میں جو چالیس اور بعض روایات کے مطابق ستر افراد و اشخاص پر مشتمل تھا اور ایک جنگی لشکر کی طرح پورا مسلح بھی نہ ہوگا۔ اس حالت میں اگر بعض مسلمانوں کو تردد اور خوف ہوا تو بر تقاضائے بشریت ہوا۔ کیونکہ وہ ایک طرف اپنی بے سازوسامانی اور دوسری جانب لشکر قریش کی جنگ سامانی دونوں کا احساس رکھتے تھے۔

علاوہ ازیں اربابِ روایات نے اس حقیقت کو بالکل نظرانداز کردیا کہ اب سے پہلے تمام چھاپہ مار دستوں میں، یہاں تک کہ غزوہ العشیرہ جس میں دوسو صحابہ شریک تھے

اس میں بھی حضورؐ نے کسی انصاری کو کبھی شریک نہیں کیا۔ آخر آج وہ کونسی نئی بات ہے جس کے باعث حضورؐ انصار کو نہ صرف شریک کرتے ہیں، بلکہ ان کی تعداد مہاجرین سے بھی زیادہ رکھتے ہیں، پھر یہ کیا بات ہے کہ چالیس اور زیادہ سے زیادہ ستر افرادِ کاروان سے تعرض کرنے کے لئے حضورؐ تین سو سترہ افراد کا مجمع لے کر روانہ ہو رہے ہیں اور وہ کس اہتمام کے ساتھ! مہاجرین اور انصار کا نمائندہ الگ الگ جان سپاری و فداکاری کا یقین دلاتا ہے، سب شرکاء مہم کو فوج کی طرح تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ہر دستہ کا جھنڈا الگ ہے، خود حضورؐ سب کے قائد اعظم یعنی کمانڈر انچیف ہیں اور آپ کے جھنڈے کا رنگ مختلف ہے، مدینہ کی دیکھ بھال اور امامت صلوٰۃ کے لئے الگ الگ دو اصحاب مقرر کئے گئے ہیں! سوچنا چاہئے کہ یہ اہتمام اور بندوبست ایک چھاپہ مار دستہ کے لئے ہوتا ہے یا فوج کے لئے، اس بنا پر ہمیں اس میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ گو صحابہ میں اس کا چرچا عام نہ ہو، جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا تعلق ہے آپ مدینہ سے اس عزم کے ساتھ روانہ ہوئے تھے کہ لشکر قریش سے معرکہ آرائی کرنی ہے، پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ کرنی چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وسائل و ذرائع معلومات سب مادی ہی تو نہ تھے، غیبی اور روحانی بھی تو تھے، چنانچہ قرآن مجید کی آیتِ ذیل میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے:

اذ یریکھم اللہ فی منامک قلیلاً ط ولو اراکھم کثیراً لفشلتم ولتنازعتم فی الامر ولکن اللہ سلّم ط انہ علیم بذات الصدور ط

اس سلسلہ کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو آپ کے خواب میں کم کر کے دکھایا، اور اگر وہ ان کو زیادہ تعداد میں دکھاتا تو تم ہمت ہار دیتے اور لڑائی کے بارہ میں آپس میں جھگڑ پڑتے، لیکن خدا نے تم کو اس سے بچا لیا، بیشک وہ دل کی اندرونی باتوں سے واقف ہے۔

لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہاں معاملہ لشکر قریش کا تو اب پیدا ہوا تھا۔ ابوسفیان کے کاروان کا معاملہ اور اس کا عام چرچا تو بہت پہلے سے مدینہ میں بپا تھا اور شام سے اس کی واپسی کے دن گنے جا رہے تھے۔ اب اس وقت صورت حال یہ ہے کہ لشکرِ اسلام مدینہ سے روانہ ہو رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا عندیہ بعض سیاسی اور جنگی مصلحتوں کے باعث مدینہ میں عام نہیں ہونے دیا ہے[1]۔ قافلہ ابی سفیان مسلمانوں کے پیچھے آ رہا ہے، ایک دو منزل طے کرنے کے بعد مسلمانوں کو بھی عام طور پر اس کا علم ہو جاتا ہے کہ لشکر قریش مکہ سے آ رہا ہے لیکن انھیں یہ نہیں معلوم کہ اُن کا پہلا سابقہ کس سے ہوگا ؛ کاروان ابوسفیان

---

[1] ان میں سب سے بڑی مصلحت یہ تھی کہ یہود اور منافقین کی طرف سے اطمینان نہ تھا۔ ممکن ہے ان کو اس کی خبر ہوتی کہ آپ جنگ کے لئے جا رہے ہیں اور لشکر قریش بڑے ساز و سامان کے ساتھ آیا ہے تو وہ یہاں مدینہ میں فتنہ کھڑا کر دیتے، اور یوں بھی حضورؐ کی عام عادت تھی کہ جب کسی جنگ کا ارادہ فرماتے تو صاف لفظوں میں اس کا اظہار نہیں فرماتے تھے، چنانچہ صحیح بخاری باب غزوۂ تبوک میں حضرت کعب بن مالک کا یہ قول منقول ہے:

ولم یکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرید غزوۃ الا ورّی بغیرھا	اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو اس کے اظہار میں توریہ سے کام لیتے تھے۔

اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہے کہ حضرت کعب بن مالک نے یہ فقرہ اپنی غزوۂ تبوک میں عدم شرکت کی داستان کے سلسلہ میں کہا ہے اور اسی ذیل میں انھوں نے غزوۂ بدر کا بھی ذکر کیا ہے، گویا وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسے مواقع پر توریہ پسندی کے باعث مجھکو غزوۂ تبوک میں جو مغالطہ ہوا تھا وہی مغالطہ غزوۂ بدر میں پیش آیا۔ کیونکہ وہاں تو عام خبر یہی تھی کہ حضور کاروان ابوسفیان کے ارادہ سے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ے یا لشکر قریش سے ، لیکن ظاہر ہے اُن میں سے اکثر کی اندرونی خواہش یہ ہوگی کہ سالقہ کاروانِ
وسفیان سے ہو تو بہتر ہے ، لیکن خدا کو منظور کچھ اور ہی تھا ، قرآن مجید میں اس صورتِ
ل کی محاکات اس طرح کی گئی ہے :

ذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین
ھا لکم وتودون ان غیر ذات
شوکۃ تکون لکم ویرید اللہ ان
ق الحق بکلمٰتہٖ ویقطع دابر الکافرینۙ
ق الحق ویبطل الباطل ، ولو کرہ
جرمون ۵

اور اس وقت کو یاد کرو کہ جب اللہ نے قریش کے دونوں طائفوں میں سے ایک طائفہ کا تم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تم کو ملے گا ، تم اسے پسند کرتے تھے کہ تمھیں وہ طائفہ ملے جس میں لڑنے کا بوتا نہیں ہے ، اور اللہ کی مرضی یہ تھی کہ اپنے حکم سے دین حق کو قائم کرے اور کافروں کی جڑ بنیاد کاٹ ڈالے ، تاکہ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دکھائے اگرچہ مجرموں کو براہی کیوں نہ لگے ۔

حسب ذیل آیت بھی اسی سلسلۂ بیان کی ایک کڑی ہے :

انتم بالعدوۃ الدنیا وھم
عدوۃ القصوی والرکبُ اسفل
نکم ط ولو تواعدتم لاختلفتم
المیعٰد ولکن لیقضی اللہ امراً کان
معولاً لیھلک من ھلک عن بینۃٍ

یہ وہ وقت تھا جب کہ تم (مسلمان) میدان جنگ کے ورلے سرے پر تھے اور وہ پرلے سرے پر ، اور قافلہ (ابوسفیان) تم سے نیچے کی طرف کو ہٹا ہوا تھا ، (یعنی وہ پہلو بچا کر ساحل کے راستہ پر پڑ لیا تھا) اگر تم پہلے سے ایک

یہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جا رہے ہیں ۔ اگرچہ حضور کا مقصد کچھ اور تھا جس کی تصدیق بعد کے
تعات سے ہو گئی ۔

ویحییٰ من حیَّ عن بینۃٍ ط وان اللّٰہ لسمیعٌ علیمٌ ٥

دوسرے سے وعدہ کرتے تو وقت مقررہ کے بارہ میں آپس میں اختلاف کر بیٹھتے، لیکن اللہ تو حکم کر چکا تھا کہ جنگ ہو کر رہے تاکہ جس کو ہلاک ہونا ہے وہ علانیہ ہلاک ہو اور جس کو زندہ رہنا ہے وہ کھلم کھلا زندہ رہے اور بیشک اللہ سب کچھ سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے۔

یہاں تک روایات اور واقعات کو منقح کر کے واقعہ کی اصل صورتِ حال جو ہم نے لکھی ہے وہ اس درجہ بے غل وغش ہے کہ غزوۂ بدر کے سلسلہ میں قرآن مجید کی آیات پر منطبق ہو جاتی ہے اور روایات میں باہم جو تعارض نظر آتا ہے وہ بھی رفع ہو جاتا ہے، مثلاً صحیح بخاری باب غزوۂ بدر میں ہے کہ حضرت کعب بن مالک نے ایک مرتبہ بیان کیا کہ میں غزوۂ تبوک کے علاوہ کسی اور غزوہ سے غیر حاضر نہیں ہوا۔ اور رہا غزوۂ بدر! تو اس میں عدم شرکت کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاروانِ قریش کے ارادہ سے نکلے تھے، لیکن اللہ نے آپ کو اور دشمنوں کو جمع کر دیا، اور پہلے سے کسی قرارداد کے بغیر جنگ ہو گئی۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ عدم شرکت کی وجہ حضور کا کاروان قریش سے تعرض کرنے کی غرض سے مدینہ سے نکلنا تھا، لیکن ابن سعد اور تفسیر ابن جوزی میں بعض روایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے "وان فریقاً من المومنین لکارھون" کا مصداق وہ لوگ ہیں جنھیں معلوم تھا کہ حضورؐ جنگ کے لئے جا رہے ہیں۔ ہمارے مذکورہ بالا بیان کے مطابق ان دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہو گی کہ عام طور پر شہرت تو یہی تھی کہ حضور کاروان قریش کے ارادہ سے جا رہے ہیں اس بنا پر حضرت کعب بن مالک نے جو خیال کیا وہ بیجا نہیں تھا، لیکن اگر خاص مدینہ میں نہیں تو کچھ دور جانے کے بعد پتہ چل ہی گیا تھا کہ لشکر قریش سے جنگ کرنی ہے

اس بناپر اگر بعض حضرات اپنی بے سروسامانی کے باعث جنگ سے کترانے لگے ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

ایک اہم نکتہ اس موقعہ پر ہم ایک اہم نکتہ کی طرف بھی قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جس پر کسی نے دھیان نہیں دیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ غزوۂ بدر سے پہلے سات آٹھ مرتبہ چھاپہ مار دستے روانہ کئے گئے ہیں جن میں سے بعض میں خود حضورؐ بھی شریک ہوئے ہیں، لیکن کسی دستہ کو کامیابی نہیں ہوئی، اور نہ کوئی شخص ہلاک ہوا۔ سریۂ عبداللہ بن جحش کا جو معاملہ ہوا وہ بالکل اچانک ناگزیر حالات میں اور حضورؐ کی اجازت کے بغیر ہوا تو کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ درحقیقت حضورؐ کا مقصد تجارتی قافلہ کی غارتگری کرنا تھا ہی نہیں، بلکہ قریش پر یہ اثر پیدا کرنا تھا کہ اب ان کی تجارتی لائن محفوظ نہیں رہی ہے، اس لئے ان کی خیر اسی میں ہے کہ وہ معلوم شرائط پر حضورؐ سے مصالحت کریں، ورنہ اگر قافلہ پر دھاوا بول دینا ہی آپ کا اصل مقصد و منشا ہوتا تو یقیناً کاروان ابوسفیان بھی آپ سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔ کیونکہ بدر اور بحراحمر کے ساحل کے درمیان فاصلہ ہی کتنا ہے؟ صرف تیس کیلومیٹر کا۔ اور آپ اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ ابوسفیان کو اگر بدر میں مسلمانوں کی موجودگی کی کن پھن مل گئی تو وہ راستہ بدل کر ساحل کی راہ سے نکل جائے گا۔ اس بناپر آپ باآسانی یہ کر سکتے تھے کہ ساحل کے راستہ پر بھی روک لگا دیتے، لیکن آپ نے اگر ایسا نہیں کیا تو کیا ہمارا یہ سمجھنا غلط ہے کہ کاروان ابوسفیان کے معاملہ میں خود حضور کچھ زیادہ سرگرم نہیں تھے اور اغماض سے کام لے رہے تھے، پھر جب خود اللہ تعالیٰ کا منشا یہ تھا کہ "ولکن لیقضی اللہ امراً کان مفعولا، لیهلك من هلك عن بينة و یحیی من حیّ عن بینۃ" تو کیا خدا کے اس منشا کا انعکاس آپ کی طبیعت اور میلان پر نہ ہوگا۔

اب تک ہم نے اس بحث میں ایک مورخ کا قلم استعمال کیا ہے، اب اس سے

ہٹ کر ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہر چیز کے اسباب مادی ہی تو نہیں ہوتے، بلکہ کچھ اور بھی ہوتے ہیں جن کا مشاہدہ عام انسان نہیں کر سکتے۔ قرآن مجید کی سورۂ انفال میں غزوۂ بدر سے متعلق جو آیات ہیں ان سب کا یکجائی مطالعہ کیجئے اور ان کی اسپرٹ دیکھئے اور دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو معاملہ تقرب خاص اللہ کے ساتھ تھا اور اللہ تعالیٰ نے دین حق کو سرفراز و سربلند کرنے کے جو وعدے آپ کے ساتھ کر رکھے تھے، ان کو پیش نظر رکھئے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا تھا مشیتِ ایزدی کے ایک طے شدہ پروگرام کے ماتحت ہو رہا تھا اور حضورؐ کے نفس قدسی کو پہلے سے ہی اس سے مطلع کر دیا گیا تھا چنانچہ اسی اطلاع کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ نے تین سو تیرہ آدمیوں کی ایک نیم مسلح جماعت کو نو سو پچاس کی پوری طرح ہتیار بند اور باساز و سامان جماعت کے ساتھ بے تکلف ٹکرا دیا اور جب یہ دونوں جماعتیں مصروفِ پیکار تھیں اس وقت آپ سجدہ میں پڑے ہوئے دعا فرما رہے تھے کہ "اے خدا تو نے جس مدد کا وعدہ فرمایا ہے وہ مدد بھیج" یہ مدد کا وعدہ خدا نے کب فرمایا تھا؟ اسی وقت جب کہ مشیتِ ایزدی نے آئندہ پیش آنے والے واقعات کی ایک جھلک آپ کو دکھا دی تھی۔

عہد نبوی کے غزوات و سرایا
اور
ان کے مآخذ پر ایک نظر

(۸)

سعید احمد اکبر آبادی

روایات میں اضطراب اور ناہمواری کے اسباب

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اصل حقیقت یہی ہے جو بیان کی گئی تو پھر آخر اس کے وجوہ و اسباب کیا ہیں کہ تمام مورخین و ارباب مغازی و سِیَر یہ لکھ رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خروج عن المدینہ کاروانِ ابوسفیان سے تعرض کرنے کے ارادہ سے تھا۔ اگرچہ روایات کی اس نوعیت پر گفتگو کا اصل موقع وہ ہوگا جب ہم مآخذ پر کلام کریں گے، تاہم موقع اور محل کی مناسبت سے مختصراً یہاں بھی چند معروضات پیش کر دینا بے محل نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں امور ذیل پر غور کرنا چاہیئے۔

(۱) احادیث جن کا مرتبہ بہرحال مغازی و سیر کی روایات سے باعتبار استناد و ثقاہت بہت اونچا اور بلند ہے۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے، مولانا شبلی نے تو یہ دعویٰ کیا ہے کہ "حضرت کعب بن مالک والی حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گذرا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت کے لوٹنے کے لئے نکلے تھے" (سیرت النبی ج ۱ ص ۳۵۰) ہم یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کیونکہ اس وقت حدیث کی سب کتابیں (جن میں

سے بعض حال کی مطبوعہ ہیں، مثلاً مصنف عبدالرزاق) ہمارے پاس موجود نہیں ہیں اور نہ ہم نے
ان کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ صحیحین یعنی بخاری اور مسلم شریف میں حضرت
کعب بن مالک والی روایت جو صحیح بخاری میں غزوۂ بدر اور غزوۂ تبوک کے ذکر میں دو جگہ منقول ہے
اس کے علاوہ کوئی اور روایت اس مضمون کی صحیحین میں یا بعض اور احادیث کی متداول کتابوں
میں ہماری نظر سے نہیں گذری، اور حضرت کعب بن مالک کی روایت کا بھی مطلب کیا ہے؟
اسے ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

(۲) یہ معلوم ہے کہ محدثین نے مغازی کے ساتھ زیادہ اعتنا نہیں کیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں
امام احمد بن حنبل کا قول مشہور ہی ہے کہ وہ ان کو ساقط الاعتبار قرار دیتے تھے اور اس کی وجہ یہ ہے
کہ مغازی کے سلسلے میں جہاں کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا عمل کسی نے اگر بیان
کیا ہے تو اس کی حیثیت چونکہ حدیث کی ہو جاتی تھی اس لئے محدثین نے اپنے اصول نقد و جرح
پر اس کی جانچ پرتال کر کے اسے قبول کیا یا رد کر دیا۔ اس کے علاوہ جو اور واقعات ہوتے
تھے اسے لوگ اپنے مشاہدہ یا سمع کی بنا پر نقل کرتے تھے، اور چونکہ اس زمانہ واقعات کو عین
موقع پر یا اس کے فوراً بعد قلمبند کرنے کا رواج نہیں تھا اس بنا پر ان واقعات کی حیثیت سنی
سنائی اور بعض کے لئے دیکھی دکھائی باتوں کی ہوتی تھی،

(۳) جب کبھی کوئی اہم واقعہ پیش آتا ہے جس میں اشخاص و افراد کی بڑی تعداد شریک
ہوتی ہے تو وہ خود یا دوسرے حضرات جب اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو اس میں چند نفسیاتی
عوامل ہوتے ہیں جو غیر شعوری طور پر اس میں کام کرتے ہیں۔ اور یہ نفسیاتی عوامل اس درجہ قوی ہوتے
ہیں کہ اگر ان کے زیر اثر کچھ لوگ خلاف واقعہ بھی کوئی بات نقل کر دیتے ہیں تو رفتہ رفتہ یہی بات
تاریخ بن جاتی ہے، اور لوگ اسے ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے نقل کرنا شروع کر دیتے ہیں،
چنانچہ ہمارے ملک میں بدقسمتی سے آئے دن فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں
کہ اصل واقعہ کیا ہوتا ہے اور فریقین کے لوگ اسے کس کس رنگ میں بیان کرتے ہیں، اس

سلسلہ میں واقعہ کے جن اجزا کی حیثیت درحقیقت ایک گپ یا افواہ کی ہوتی ہے کثرت نقل و روایت کے باعث وہ بھی سب کے نزدیک نہیں تو ایک فریق متعلق کے نزدیک یقیناً ایک تاریخی حقیقت ہوتے ہیں اور یہ لوگ اسے اسی طرح نقل کرتے ہیں، یہ سب کچھ نفسیاتی عوامل کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

(۴) ان نفسیاتی عوامل میں سب سے زیادہ موثر چیز وہ ہوتی ہے جسے نفسیات کی اصطلاح میں انگریزی میں obsession of mind کہتے ہیں یا وہ چیز ہوتی ہے جسے Auto suggestion کہتے ہیں، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً کسی واقعہ کے سلسلہ میں اس کے وقوع سے قبل کسی وجہ سے کوئی ایک خیال آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود ہوتا ہے، اب اس کے بعد واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے تو آپ اس کی روایت کرتے ہیں یا اُس سے کوئی اثر لیتے ہیں تو یہ دونوں آپ کے اسی خیال کے مطابق ہوتے ہیں جو آپ نے پہلے سے ہی دماغ میں قائم کر رکھا تھا، اگرچہ واقعہ کی اصل حقیقت اس سے جدا تھی، مثلاً ابھی حال کا واقعہ ہے، جیسا کہ برہان میں اس کا ذکر آچکا ہے، مجھے ۲ر فروری کو گوہاٹی کی ایک تقریب میں شامل ہونا تھا، اس سلسلہ میں ایک روز جناب محمد مسلم صاحب اڈیٹر روزنامۂ دعوت دہلی نے فون پر مجھ سے کہا کہ آپ کے سفر گوہاٹی کے موقع پر آسام کی جماعت اسلامی آپ کو استقبالیہ دینا چاہتی ہے، ازراہ کرم اسے منظور کر لیجئے، میں نے پوچھا کب؟ انھوں نے تو غالباً ۳ر فروری ہی کہا ہوگا، مگر میں نے ۴ر فروری سنا۔ اب لطف کی بات یہ ہے کہ اس گفتگو کے چند روز کے بعد آسام کی جماعت اسلامی کا بھی باقاعدہ دعوت نامہ آگیا اور اس میں صاف طور پر ۳ر فروری کی تاریخ لکھی تھی، لیکن چونکہ میرے دماغ پر ۴ر فروری کی تاریخ مسلط تھی اس لئے میں نے ۳ر کو ۴ر ہی پڑھا اور اسی تاثر کے ساتھ گوہاٹی گیا۔ وہاں جب معلوم ہوا کہ استقبالیہ ۴ر کو نہیں ۳ر کو ہے تو میں نے پوچھا کیا آپ نے تاریخ بدل دی ہے؟ ان حضرات نے فرمایا: جی نہیں! یہ تاریخ وہی ہے جس کا ذکر مسلم صاحب نے فون

پر کیا تھا اور دعوت نامہ میں بھی یہی تاریخ درج تھی، گھر واپس آکر میں نے یہ دعوت نامہ دوبارہ پڑھا تو اُس میں بجائے ۲ کے ۳ فروری کی ہی تاریخ لکھی تھی۔

Auto Suggestion کی ایک دلچسپ مثال سنئے! قیام کلکتہ کے زمانہ میں ایک مرتبہ وطن آیا ہوا تھا، جب واپس پہونچا تو کلکتہ کے مشہور روز نامۂ امروز کا ایک پرانا پرچہ میری میز پر رکھا ہوا تھا۔ میں اسے اٹھا کر پڑھنے لگا تو یہ دیکھکر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اُس میں سیرت النبی کے ایک مقامی جلسہ کی روئداد چھپی تھی اور اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ آخر میں سعید احمد اکبر آبادی پرنسپل کلکتہ مدرسہ کی تقریر ہوئی اور انھوں نے یہ کہا وہ کہا اور خوب کہا چند روز کے بعد امروز کے اڈیٹر سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا: بھئی! آپ بھی کمال کرتے ہیں اس دن میں سرے سے کلکتہ میں موجود ہی نہیں تھا اور اس کے باوجود آپ نے یہ چھاپ دیا کہ میں نے اس روز کے جلسہ میں تقریر کی ہے۔ یہ سن کر موصوف نے حسب عادت ایک زور کا قہقہہ لگایا اور بولے: اصل بات یہ ہے کہ اُس جلسہ میں نہ میں گیا اور نہ اخبار کا کوئی اور رپورٹر گیا۔ لیکن خبر دینا ضروری تھا اور جلسہ کے اشتہار میں آپ کا نام دیا ہوا تھا اور پھر مجھے یہ معلوم تھا کہ (۱) آپ ہمیشہ آخر میں تقریر کرتے ہیں (۲) تقریر اچھی کرتے ہیں اور (۳) یہ بھی معلوم تھا کہ سیرت کی تقریروں میں آپ کیا کہتے ہیں! ان مفروضات کی بنا پر آپ کے متعلق میں نے وہ خبر تصنیف کر لی اور اخبار میں دے دی۔

(۵) یہ نفسیاتی عوامل ہر انسان میں غیر شعوری یا نیم شعوری طور پر کام کرتے ہیں، کسی راوی کا ثقہ اور معتبر ہونا اُن کے منافی نہیں ہے، احادیث کی روایات میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت فاطمہ کا نکاح حضرت علی سے ہو گیا اور رخصتی کے بعد حضرت علی ان کو لیکر کاشانۂ نبوت سے روانہ ہونے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا: "تم ذرا میرا انتظار کرنا" تھوڑی دیر کے بعد آپ پہونچ گئے، دولھا اور دلہن دونوں کو برکت دی اور تلقین خیر سے نوازا۔ اسی اثنا میں آپ کو گھر میں ایک انسانی

سایہ نظر آیا، آپ نے پوچھا "کون ہیں" معلوم ہوا کہ اسمار بنت عمیس ہیں جو حضرت فاطمہ کی دلجوئی کے خیال سے ساتھ چلی آئی تھیں، حضور اس سے بہت مسرور ہوئے اور اُن کو دعائیں دیں، اس روایت میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ راوی نے ان خاتون کا نام اسمار، بتایا ہے، لیکن جیسا کہ حافظ ابن حجر نے المطالب العالیہ میں لکھا ہے حضرت اسمار ان دنوں میں مدینہ میں سرے سے موجود ہی نہ تھیں اور اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ میں مقیم تھیں، راوی کو دراصل مغالطہ اس سے ہوا کہ عمیس کی دو صاجزادیاں تھیں ایک جو بڑی تھیں اُن کا نام اسمار تھا اور چھوٹی صاجزادی کا نام سلمیٰ تھا۔ لیکن چونکہ زیادہ مشہور بڑی بہن ہیں اور زیادہ تر روایات میں نام انھیں کا آتا ہے اس بنا پر راوی نے جب یہ سنا کہ عمیس کی صاجزادی وہاں موجود تھیں تو لاشعوری طور پر اس کا ذہن حضرت اسمار کی طرف منتقل ہو گیا اور اپنی طرف سے روایت میں اس کا اضافہ کرکے اسے آگے بڑھا دیا۔ یا اصل مروی عنہ نے نام حضرت سلمیٰ کا ہی لیا ہو گا لیکن راوی کے دماغ میں حضرت اسمار کا نام الیسا رچا بسا تھا کہ جب اس نے روایت کی تو اس کی زبان سے بے ساختہ بجائے سلمیٰ بنت عمیس کے اسمار کا نام نکل گیا۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے معلوم ہوا ہو گا کہ کسی واقعہ کو آنکھ بند کر کے محض اس لئے قبول کر لینا کہ کسی نے اس کو بیان کیا ہے یا وہ کسی کتاب میں لکھا ہوا ہے شیوۂ مردانگی اور طریقہ علم و تحقیق نہیں۔ بلکہ اس کو قبول کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ واقعہ کب پیش آیا، کہاں پیش آیا، کس کس نے اُسے دیکھا، یہ دیکھنے والے کس مشرب اور خیال کے لوگ تھے، ان کی عقل اور ان کی قوتِ اظہار مافی الضمیر کا کیا حال ہے، جس شخص کی نسبت وہ واقعہ اور جس زمان و مکان اور جس ماحول میں اس کا وقوع بیان کیا جاتا ہے وہ عقلاً، عرفاً یا عادۃً ممکن بھی ہے یا نہیں اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں محتاط رہنے کی تاکید کی اور فرمایا ہے:

وکفی بالمرءِ کذباً ان یحدث بکل ماسمع	ایک شخص کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے نقل کر دے۔

لیکن افسوس ہے ہمارے راویوں نے ان اصول تنقید اور اس فرمان نبوی کا لحاظ کم رکھا ہے یہاں تک کہ بعض کتب حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی سے متعلق چند ایسی باتیں ملتی ہیں جن کی نسبت ایک شخص قسم کھا کر کہہ سکتا ہے کہ آپ کی طرف اُن کا انتساب ناممکن ہے۔

اب ان اصول کو پیش نظر رکھ کر غور کیجئے تو صاف نظر آتا ہے کہ چونکہ کاروان ابوسفیان کا مدینہ میں بہت دنوں سے چرچا تھا اور وہ دماغوں پر چھایا ہوا تھا اور یہ طے تھا کہ وہ ادھر سے واپسی میں گذرے گا تو اس سے تعرض کیا جائے گا، اس فضا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لشکر قریش کے مکہ سے روانگی کی اطلاع ملتی ہے تو (حدیث کعب بن مالک کے مطابق) اس معاملہ میں حسب عادت توریہ سے کام لیتے ہیں مگر ساتھ ہی صحابۂ کرام سے مشورہ اور ان سے گفتگو کے بعد آپ ادبدا کے روانگی کا حکم دے دیتے ہیں، اس بنا پر عموماً obsession of mind کے باعث اندرونی اور بیرونی طور پر محسوس یہ ہی ہوتا تھا کہ مدینہ سے روانگی کا مقصد کاروان ابوسفیان کو جالینا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو چیزیں ایک لشکر کا مظہر اور علامت ہوسکتی تھیں وہ بھی اسی عام احساس اور مفروضہ کے قالب میں ڈھلتی چلی گئیں فلا عجب ولا غرابۃ فیہا خاص اس ایک مسئلہ پر گفتگو ذرا طویل ہوگئی، لیکن حکایت لذیذ ہوتی ہے تو اس کا بیان دراز تر ہو جاتا ہے، اسی طرح دردِ دل کو سنانے کا موقع مل جاتا ہے تو کہانی خودبخود پھیلتی جاتی ہے

بدر

اب جب کہ جنگ شروع ہونے والی ہے آپ بدر کا نقشہ ذہن میں محفوظ کر لیجئے، اس سلسلہ میں قدیم و جدید مورخین نے بہت کچھ لکھا ہے، لیکن ہمارے نزدیک سب سے زیادہ قابل اعتماد ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا بیان ہے جنھوں نے خود وہاں جاکر تاریخ و جغرافیہ کی کتابوں کی روشنی میں اس پورے علاقہ کی پیمائش (Survey) کیا اور غزوہ کے سلسلہ کے ایک ایک جزئی واقعہ کا محل وقوع متعین کیا، کتاب کا یہ پورا باب بیحد دلچسپ اور بصیرت افروز ہے، ہم یہاں موقع کی مناسبت سے اس کا صرف ایک ٹکڑا نقل کرتے ہیں، موصوف لکھتے ہیں:

"بدر ایک بیضوی شکل کا میدان ہے، کوئی ۱/۲ ۵ میل لمبا اور تقریباً چار میل چوڑا، اطراف میں بلند پہاڑ ہیں، مکہ، شام اور مدینہ جانے کے راستے جو وادیوں میں سے گذرتے ہیں یہیں ملتے ہیں، ترکی دور میں شریف عبدالمطلب نے اس میدان میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا تھا، اب وہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے، یہ میدان سنگلاخ یا ریتیلا ہے، مگر جنوب مغربی حصہ کی زمین نرم ہے، جنگ بدر کے دن بارش ہوئی تو یہ مقام جہاں قریش کا پڑاؤ تھا دلدل بن گیا تھا۔ مگر اب یہاں سرسبز نخلستان ہے، بدر کے اطراف میں جو پہاڑ ہیں ان کے مختلف حصوں کے مختلف نام ہیں، ان میں دور دور تک سفید ریت کے تودے نظر آتے ہیں، آج بھی ان سفید پہاڑیوں میں سے ایک کا نام العدوۃ الدنیا اور دوسری کا نام العدوۃ القصوی ہے، ان دونوں کے درمیان جو بہت اونچا پہاڑ ہے اسے اب جبل اسفل کہتے ہیں، کیونکہ اس کے پیچھے دس بارہ میل پر سمندر ہے اور ابو سفیان کا قافلہ راستہ کترا کر ساحل کے کنارے کنارے نکل گیا تھا۔" (عہد نبوی کے میدان جنگ)

جیسا کہ قرآن مجید میں ہے، لشکر اسلام کا پڑاؤ العدوۃ الدنیا پر تھا، لیکن جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام موزوں نہیں تھا، اس لئے حضرت حباب بن منذر کے مشورہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام سے آگے بڑھکر اس جگہ پر پڑاؤ ڈالا جو آج کل بدر کی موجودہ آبادی میں مسجد عریش کے اردگرد ہے[۱] یہاں ایک چشمہ تھا،[۲] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

۱؎ اس مسجد کو عریش کہنے کی وجہ یہی ہے کہ یہ ٹھیک اُس جگہ بنی ہوئی ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک جھونپڑی (عریش) بنائی گئی تھی، یہ ایک پہاڑی پر واقع ہے اور یہاں سے پورا میدان جنگ نظر آتا تھا، اگرچہ اب اس کے اردگرد نخلستانوں کے باعث وہ نظر نہیں آتا۔ ۲؎ یہ چشمہ اب بھی ہے اور اس کا پانی مسجد عریش اور ایک اور مسجد کے صحن سے گذرتا ہے اور اسی سے وضو کرتے ہیں۔

"بدر ایک بیضوی شکل کا میدان ہے، کوئی ۱/۲ ۵ میل لمبا اور تقریباً چار میل چوڑا، اطراف میں بلند پہاڑ ہیں، مکہ، شام اور مدینہ جانے کے راستے جو وادیوں میں سے گذرتے ہیں یہیں ملتے ہیں، ترکی دور میں شریف عبدالمطلب نے اس میدان میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا تھا، اب وہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے، یہ میدان سنگلاخ یا ریتیلا ہے، مگر جنوب مغربی حصہ کی زمین نرم ہے، جنگ بدر کے دن بارش ہوئی تو یہ مقام جہاں قریش کا پڑاؤ تھا دلدل بن گیا تھا۔ مگر اب یہاں سرسبز نخلستان ہے، بدر کے اطراف میں جو پہاڑ ہیں ان کے مختلف حصوں کے مختلف نام ہیں، ان میں دور دور تک سفید ریت کے تودے نظر آتے ہیں، آج بھی ان سفید پہاڑیوں میں سے ایک کا نام العدوۃ الدنیا اور دوسری کا نام العدوۃ القصوی ہے، ان دونوں کے درمیان جو بہت اونچا پہاڑ ہے اسے اب جبل اسفل کہتے ہیں، کیونکہ اس کے پیچھے دس بارہ میل پر سمندر ہے اور ابوسفیان کا قافلہ راستہ کترا کر ساحل کے کنارے کنارے نکل گیا تھا۔" (عہد نبوی کے میدان جنگ)

جیسا کہ قرآن مجید میں ہے، لشکر اسلام کا پڑاؤ العدوۃ الدنیا پر تھا، لیکن جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام موزوں نہیں تھا، اس لئے حضرت حباب بن منذر کے مشورہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام سے آگے بڑھ کر اس جگہ پر پڑاؤ ڈالا جو آج کل بدر کی موجودہ آبادی میں مسجد عریش کے ارد گرد ہے[1] یہاں ایک چشمہ تھا[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] اس مسجد کو عریش کہنے کی وجہ یہی ہے کہ یہ ٹھیک اُس جگہ بنی ہوئی ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک جھونپڑی (عریش) بنائی گئی تھی، یہ ایک پہاڑی پر واقع ہے اور یہاں سے پورا میدان جنگ نظر آتا تھا، اگرچہ اب اس کے ارد گرد نخلستانوں کے باعث وہ نظر نہیں آتا۔ [2] یہ چشمہ اب بھی ہے اور اس کا پانی مسجد عریش اور ایک اور مسجد کے صحن سے گذرتا ہے اور اسی سے وضو کرتے ہیں۔

اس چشمہ پر قبضہ کر لیا اور حکم دیا کہ ایک بڑا حوض بنا کر اس چشمہ کا پانی جمع کر لیا جائے تاکہ مویشیوں کے کام آئے اور ایک لشکر کی ضرورتیں اس سے پوری ہوں، صحابۂ کرام نے اس میدان میں ایک بلند مقام پر آپ کے لئے ایک جھونپڑی بھی بنائی جسے عربی میں عریش یا عریشہ کہتے ہیں، پھر اس کی حفاظت کے لئے ایک دستہ جو انصار کے چند نوجوانوں پر مشتمل تھا، قیام گاہ نبوی کے لئے مقرر ہوا حضرت سعد بن معاذ اس دستہ کے امیر تھے، علاوہ ازیں حضرت ابوبکر صدیق آپ کی معیت میں تھے اور ساتھ ہی ایک سانڈنی متعین کر دی گئی تاکہ حضور کو کہیں جانا ہو یا مدینہ کوئی خبر پہونچانی ہو تو اس سے کوئی کام لیا جائے، اسی سلسلہ میں حضور نے گھوم پھر کر پورے میدان کا جائزہ لیا اور فرماتے رہے کہ اس جگہ قریش کا فلاں سردار اور اُس جگہ فلاں سردار مارا جائے گا۔
(صحیح بخاری غزوۂ بدر)

قریش کی حرکت

اب لشکر قریش نے بھی حرکت کی اور اُس نے العدوۃ القصویٰ سے روانہ ہو کر لشکر اسلام کے سامنے اپنی پوزیشن سنبھال لی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فخر اور گھمنڈ کے ساتھ اتراتے ہوئے آتے دیکھا تو دعا کے لئے دست مبارک اٹھائے اور کمال عجز و نیازمندی کی ایک ادائے والہانہ کے ساتھ فتح و کامرانی کی دعا کی اور پھر صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا: فتح نہ کثرتِ تعداد پر موقوف ہے اور نہ ساز و سامان کی بہتات پر! فتح کا دار و مدار صبر و استقامت پر ہے، اس کے بعد آپ نے صحابہ کو صبر و استقامت کی تلقین فرمائی۔ اِدھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر قریش نے ایک شخص عمیر بن وہب الجمعی کو بھیجا کہ وہ اسلامی لشکر کا ایک جائزہ لے کر آئے، اس نے گھوڑے پر سوار ہو کر ایک چکر لگایا اور بتایا کہ ان کی تعداد تو تین سو کے لگ بھگ ہے، لیکن اے قریش! میں نے تمہارے مقابلہ میں ایک ایسی قوم دیکھی ہے جن کے پاس تلواروں کے سوا کچھ نہیں ہے، لیکن اُن کے عزم کا یہ عالم ہے کہ جب تک تم میں سے ایک شخص کو اُن کا ایک شخص ختم نہیں کر دے گا وہ نہیں مرے گا۔ تو اب بتاؤ! اس کے بعد زندگی کا کیا لطف

باقی رہ جاتا ہے، اب جو تمھاری رائے ہو۔

قریش میں اختلاف رائے

عمیر بن وہب الجمحی کی اس تقریر کے بعد قریش میں پھوٹ پڑ گئی، عتبہ بن ربیعہ اور حکیم بن حزام دونوں جنگ کے مخالف ہو گئے، اول الذکر نہایت باا‌ثر شخص تھا۔ وہ کھڑا ہوا اور مجمع کو خطاب کر کے بولا: "لوگو! تم کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اُن کے ساتھیوں کے ساتھ جنگ کر کے کیا ملے گا؟ اگر تم کو فتح ہو بھی گئی تو کس کام کی؟ ہم میں سے ہر شخص دیکھے گا کہ اُس کا قریبی عزیز اُس کے ہاتھ سے قتل ہوا ہے، اور اگر کامیابی اُن لوگوں کو حاصل ہوئی تب بھی یہی ہوگا! اس لئے بہتر یہ ہے کہ لوٹ چلو اور محمد اور باقی عرب کے درمیان حائل نہ ہو۔" ابوجہل نے یہ سنا تو حسب عادت سخت برہم ہوا۔ عمرو بن الحضرمی (جو سریۂ عبداللہ بن جحش کے ہاتھوں قتل ہوا تھا) کے بھائی عامر بن الحضرمی کو ورغلا کر بولا: دیکھتے ہو! ٹھیک اس وقت جب کہ تمھارے بھائی کے خون کا بدلہ آنکھوں کے سامنے ہے تمھارا حلیف عتبہ لوٹ جانا چاہتا ہے، اٹھو! اور اپنے بھائی کا قصاص طلب کرو، عامر نے جب یہ سنا تو عرب کے قاعدہ کے مطابق کپڑے پھاڑ کر ہائے عمر ہائے عمر چیخنا شروع کر دیا۔ مجمع میں اس سے آگ لگ گئی اور لڑائی کا جوش وخروش از سرنو پیدا ہو گیا، ابوجہل نے عتبہ کو بھی بزدلی اور پست ہمتی کا طعنہ دیا تھا۔ عتبہ اس پر بگڑ گیا اور بولا کہ اچھا! اگر یہی ہے تو میدان جنگ گرم ہونے دو پھر سب کو معلوم ہو جائے گا کہ بزدل اور نامرد کون ہے؟ تم یا میں! یہ کہکر اٹھا۔ سر سے کپڑا لپیٹا اور ہتیار سج سجا جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔

ابوجہل اور اخنس کی گفتگو

اس موقع پر بعض مورخین نے یہ واقعہ بھی لکھا کہ اخنس بن شریق جو اپنے قبیلہ بنو زہرہ کے لوگوں کے ساتھ لشکر سے الگ ہو کر درمیان راہ سے واپس ہو گیا تھا۔ اس موقع پر پھر ابوجہل سے ملا اور اس سے کہا: "ابوالحکم! (ابوجہل کی اصل کنیت) کیا تم سمجھتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جھوٹ بولتے ہیں!" ابوجہل نے جواب دیا: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کے بارہ میں کذب بیانی کریں، جب کہ ہم نے ان کا نام امین رکھ چھوڑا تھا

کیونکہ انھوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ بنو عبد مناف میں سقایت، رفادہ حجابت اور مشورہ (خانۂ کعبہ اور مکہ سے متعلق اہم اور معزز عہدے) تو پہلے ہی سے موجود تھے، اب اگر نبوت بھی ان میں چلی گئی تو پھر ہمارے لئے کیا رہے گا؟

لشکر اسلام کی ترتیب، صف بندی اور اس کو ہدایات

اس سے قطع نظر کہ کس نے کس واقعہ کو کہاں لکھا ہے، مندرجہ بالا واقعات کی ترتیب کافی غور و خوض کے بعد ہماری اپنی قائم کی ہوئی ہے، ہمارے نزدیک یہ واقعات روز پنجشنبہ ۱۶ رمضان المبارک ۲ھ کے ہیں، اب درمیان میں صرف ایک شب باقی تھی، اگلا دن معرکۂ کارزار کے گرم ہونے کا تھا۔ جامع ترمذی کی ایک روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کی تقسیم شب میں ہی کر لی تھی، چنانچہ مہاجروں کا علم حضرت مصعب بن عمیر کو، خزرج کا علم حضرت حباب بن منذر کو اور اوس کا حضرت سعد بن معاذ[1] کو عطا ہوا، اس طرح فوج تین حصوں میں تقسیم کی گئی، رات کا ایک معتدبہ حصہ آپ نے تسبیح و تہلیل میں بسر کیا۔ دوسرے دن یعنی بروز جمعہ ۱۷ رمضان کو علی الصباح آپ نے لشکر کی صف بندی کی اس کے بعد ایک چھڑی دست مبارک میں لئے ہوئے ان صفوں کا جائزہ لیا۔ حکم یہ تھا کہ سب لوگ سرو قامت ایک دوسرے کے ساتھ کاندھا اور قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہوں، کوئی شخص نہ صف سے آگے ہو اور نہ پیچھے۔

عورتوں کی شرکت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر اسلام کی خدمت کے لئے رضاکار خواتین کا ایک دستہ بھی مقرر فرمایا تھا۔ اس دستہ کے فرائض یہ تھے کہ سپاہیوں کو پانی پلائیں، دشمن فوج کے جو افراد قتل ہوں یا زخموں کی تاب نہ لا کر گر پڑیں اُن کے ہتھیار، نیزہ یا تلوار وغیرہ جمع کر کے مسلمان تدر اندازوں کے حوالہ کریں اور مسلمان زخمیوں

---

[1] مگر یہ مشتبہ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جیسا کہ ابھی گذرا حضرت سعد بن معاذ اُس دستہ کے امیر تھے جو قیام گاہ نبوی کی پہرہ داری کر رہا تھا

ں مرہم پٹی کریں[1]۔

ہدایات

صف بندی ہو چکی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند ہدایات دیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان صف بندی کو نہ توڑیں، لڑائی کا اُس وقت تک آغاز نہ کریں جب تک دشمن حملہ نہ کرے، دشمن دور ہو تو تیر چلا کر اسے ضائع نہ کریں، ہاں البتہ دشمن آ کر گھیرے تو تیروں سے اس کا مقابلہ کریں، نزدیک آ جائے تو پتھر ماریں اور بالکل آمنا سامنا ہو تو نیزے چلائیں[2]۔

صحابہ کا جذبۂ فداکاری و شوقِ شہادت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہدایات کے ساتھ ایک پر زور و ولولہ انگیز خطبہ بھی ارشاد فرمایا جس میں آپ نے صحابۂ کرام کو جہاد کی اہمیت و فضیلت یاد دلائی اور فرمایا: "قسم ہے اُس ذات اقدس کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، آج جو شخص صبر و استقامت کے ساتھ محض حسبۃً للہ آگے بڑھ کر جنگ کرے گا اور پشت نہیں دکھائے گا جنت بے شبہ اس کا مقدر ہو گی"۔ عمیر بن الحمام جو انصاری تھے اس وقت صف میں کھڑے تھے اور ان کے ہاتھ میں کچھ کھجوریں تھیں جن کے کھانے کا وہ ارادہ کر ہی رہے تھے کہ اب حضور کا یہ ارشاد سنا تو کھجوریں پھینک دیں، تلوار اٹھائی اور صف سے نکل دشمن کی صفوں میں والہانہ گھستے چلے گئے، اور شہید ہو گئے، کہتے ہیں غزوۂ بدر میں سب سے پہلے جس نے جام شہادت نوش کیا وہ یہی تھے، بعض حضرات حضرت عمرؓ کے غلام حضرت مہجع کو اس معرکہ کا پہلا شہید بتاتے ہیں۔

دیوانگی عشق

اسی موقع پر ایک عجیب واقعہ یہ پیش آیا کہ جب حضورؐ گھوم پھر کر لشکر کی صف بندی کرا رہے تھے آپ نے ایک شخص سواد بن غزیہ کو صف سے باہر دیکھا تو اپنی چھڑی اس کے پیٹ میں چبھوتے ہوئے فرمایا: "سواد! سیدھے کھڑے ہو"۔ سواد نے حکم کی تعمیل تو کی مگر ساتھ ہی احتجاج کے لہجہ میں بولے: "یا رسول اللہ! اللہ نے آپ کو حق اور عدل کے

---

[1] صحیح بخاری [2] واقدی بحوالۂ ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔

ساتھ مبعوث فرمایا ہے، اور آپ نے مجکو تکلیف پہونچائی ہے، اس لئے میں آپ سے بدلہ لینا چاہتا ہوں"۔ حضورؐ نے فرمایا: اچھا! اس کے بعد فوراً کرتہ اٹھایا اور ارشاد کیا: لو تم مجھ سے اپنا بدلہ لے لو۔ اب سواد نے شکم مبارک کے پے در پے بوسے لئے اور الگ ہوگئے۔ حضورؐ نے پوچھا: یہ کیا؟ سواد نے جواب دیا: "حضور! آپ دیکھ رہے ہیں کہ جنگ سر پر تلی کھڑی ہے معلوم نہیں میرا کیا انجام ہو! اس لئے میری تمنا ہوئی کہ اگر میں جنگ میں کام آجاؤں تو زندگی میں آپ سے میرا آخری سابقہ یہ ہو کہ میری جلد آپ کی جلد سے شرف اندوز و شادکام ہم آغوشی ہو" اللہ اکبر! یہ کمال عشق و محبت! ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو دعائیں دیں۔ اپنا ایک بہت پرانا شعر یاد آیا:

سر کٹ کے گرے ان کے قدم پہ دمِ آخر
یوں حسرتِ پابوس نکل جائے تو اچھا!!

دو فریق متحارب

اس وقت دو لشکر ایک دوسرے کے ساتھ صف بستہ کھڑے تھے، ایک وہ تھا جس کو اپنی طاقت وقوت، مال ومتاع پر گھمنڈ تھا، جس نے باطل پرستی کے زعم میں کلمۂ حق سننے سے انکار کر دیا تھا جو خاندانی وقار (Prestige) اور قبائلی عظمت کی حفاظت کے لئے سربکف میدان جنگ میں آیا تھا۔ جو اللہ رب السمٰوٰتِ والارض کے بجائے لات وہبل کا پرستار تھا اور جس نے سچائی، عدل وانصاف اور انسانیت کے اقدارِ عالیہ سے بغاوت کر کے اباطیل واکاذیب، اوہام وخرافات اور رذائلِ اخلاق واعمال کے ساتھ پیمان وعہدِ وفا استوار کر رکھا تھا۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا لشکر کھڑا تھا جسے جنگی اصطلاح میں نہتّا کہنا چاہیئے، اس کے پاس لے دے کے دو گھوڑے تھے اور وہ بھی بغیر زین کے، تلواریں تھیں تو نیام سے محروم، نیزے تھے مگر ڈھال نہ تھی، تیر و کمان تھے مگر خود ومغفر نہ تھے، علم تھے بوق وطبل کا نام ونشان نہ تھا۔ پھر لشکر میں ایک خاصی تعداد اُن لوگوں کی تھی جو ابھی دو برس پہلے لٹ کھسٹ اور اپنے وطن سے اُجڑ کر اِدھر آئے تھے اور باقی جو تھے وہ زراعت پیشہ

تھے۔ اس لئے ان کی بے سروسامانی ظاہر ہے، لیکن ان کو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کامل تھا، حیات مستعار کے عیش و آرام اور دنیا کے مستلذات اور مشتہیات سے انھوں نے صرف نظر کر کے اپنی زندگیاں اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامت دین کے لئے وقف کر دی تھیں، یہ حق وصداقت کے داعی ومناد اور اقدارِ عالیہ کے علمبردار تھے، یہ انسانیت کی آبرو اور مجد و شرفِ آدمیت کے لعل شب تاب تھے، دولتِ ایمان ولیقین اور توکل علی اللہ ان کا سب سے بڑا ہتیار اور صاحب ملکوت وجبروت کا وعدۂ فتح ونصرت ان کی خود اعتمادی کا واحد سہارا تھا۔

جب سے انسان عالم وجود میں آیا ہے چشم روزگار نے حق وباطل کے ہزاروں معرکے دیکھے ہیں، لیکن یہ معرکہ سب سے نرالا اور انوکھا تھا، کیونکہ تاریخ انسانی میں یہ پہلا موقع تھا جب کہ ایک پیغمبر برحق جو رحمتِ عالم بن کر آیا تھا وہ "الحق یعلو ولا یُعلیٰ" کی حقیقت کو ثبت کرنے اور اس بات کا سبق دینے کہ کوئی تحریک، خواہ کیسی ہی اعلیٰ اقدار حیات پر مبنی ہو، نطرت انسانی کے پیش نظر، جنگ کے بغیر عظیم، عالمگیر اور موثر انقلاب پیدا نہیں کر سکتی، خود شمشیر بکف میدان جنگ میں آ گیا اور اپنے بے سروسامان ساتھیوں کی ایک جماعت کو ایک طاقتور اور صاحب جاہ وحشم فوج کے مقابلہ میں لا کھڑا کر دیا تھا۔ اس لئے طبل جنگ پر تھاپ پڑنے کا وقت آیا تو کائنات عالم کا ذرہ ذرہ دم بخود ہو گیا۔ وقت کے مورخ نے قلم سنبھالا۔ پردہ نشینان حریم قدس کی ٹکٹکی بندھ گئی، سیارگانِ فلک نے اپنی آنکھیں بدر کے میدان پر گاڑ دیں، نبضِ دوراں رک گئی، گردش لیل ونہار ٹھٹک کے رہ گئی، یہ سب کچھ تھا مگر حسنِ ازل تبسم زیرِلب تھا اور غیب سے آواز آ رہی تھی:

حدیث حسن ومشتاقی درون پردہ پنہاں بود
بر آمد شوق از خلوت نہاد ایں راز بر صحرا

(نظیری)

عہد نبوی کے غزوات و سرایا اور ان کے مآخذ پر ایک نظر

(۹)

سعید احمد اکبر آبادی

جنگ شروع ہوتی ہے صفوں کی ترتیب و تنظیم اور ان کی تلقین و تعلیم سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر کے ساتھ عریشہ میں تشریف لے گئے تو اب جنگ کے شروع ہونے کا وقت آیا۔ ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق لشکر قریش کی طرف سے سب سے پہلے اسود بن عبدالاسود المخزومی جو نہایت بہادر اور جان پر کھیل جانے والا تھا اچانک صف سے باہر نکلا اور درانہ اسلامی صفوں میں گھس آیا۔ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب نے جھپٹ کر اس پر تلوار کا ایسا شدید وار کیا کہ نصف پنڈلی سمیت اس کا پاؤں کٹ گیا۔ لیکن اس حالت میں بھی وہ کودا اور حوض کی طرف لپکا جہاں پہونچنے کی اس نے قسم کھا رکھی تھی، اب حضرت حمزہ نے پلٹ کر اس پر دوسرا وار اس زور کا کیا کہ حوض کے اندر اس کا کام تمام ہوگیا۔ مخزومی کے قتل نے جنگ کی آگ بھڑکا دی، چنانچہ اب لشکر قریش کی طرف سے تین بہادر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد عبد مناف کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، یعنی شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ ایک ساتھ باہر نکلے اور عرب کے قاعدہ کے مطابق مبارزت طلب کی، اس چیلنج

کے جواب میں لشکرِ اسلام کی طرف سے قبیلۂ انصار کے تین نوجوان عوف، معاذ (جو عفرا کے بیٹوں کی نسبت سے مشہور ہیں) اور حضرت عبداللہ بن رواحہ آگے بڑھے، قریشیوں نے پوچھا: تم کون ہو؟ کس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہم انصار میں سے ہیں، یہ سن کر قریشیوں نے ان کی تعریف کی۔ لیکن ان کے ساتھ نبرد آزما ہونے سے یہ کہکر انکار کر دیا کہ ہم تو اپنی ہی قوم کے اور اپنے ہمسر لوگوں سے جنگ کرنا چاہتے ہیں، یہ سن کر تینوں انصاری نوجوان اپنی صفوں میں واپس آگئے، اور اب حضور کے حکم سے انھیں کے قبیلہ اور خاندان کے تین غازی حضرت حمزہ، حضرت عبیدۃ بن الحارث اور حضرت علی بن ابی طالب جو عمر میں سب سے چھوٹے تھے آگے بڑھ کر قریشیوں کے مدمقابل ہوئے اور مبارزت کے اصول کے ماتحت اپنا تعارف کرایا۔ قریشی بہادروں نے ان سے نبرد آزما ہونے کی ہامی بھرلی تو اب سب نے مل جل کر اپنا اپنا جوڑ منتخب کیا چنانچہ ولید بن عتبہ نے حضرت علی کو۔ حضرت عبیدہ بن الحارث نے شیبہ کو اور حضرت حمزہ نے عتبہ کو اپنا اپنا جوڑ قرار دیا[1] اور جنگ شروع ہوگئی، حضرت علی نے پہلا وار ہی ایسا بھرپور کیا کہ چشم زدن میں دشمن خاک پہ ڈھیر تھا، نوجوان بھتیجہ (حضرت علی) نے جو پھرتی دکھائی سن رسیدہ چچا (حضرت حمزہ) بھی اس سے کم نہ رہا، انھوں نے پہلو بچا کر اپنے حریف عتبہ پر اس زور کا حملہ کیا کہ وہ پچھڑ کر گرا اور دم توڑ گیا۔ اب رہا تیسرا جوڑ! تو اگرچہ حضرت عبیدۃ بن الحارث عمر رسیدہ تھے لیکن اس بہادری سے لڑے کہ شیبہ سے گتھم گتھا ہوگئے، کچھ دیر تک دونوں میں جنگ ہوتی اور ایک دوسرے پہ چوٹیں پڑتی رہیں، آخر کار حضرت عبیدہ نے پینترا بدل کر دشمن کے ایک ایسی

---

[1] صحیح بخاری باب غزوۂ بدر، صحیح بخاری میں حضرت علی سے یہ روایت بھی ہے کہ انھوں نے فرمایا: قرآن مجید کی آیت "هٰذٰن خصمان اختصموا فی ربھم" انھیں چھ قریشیوں کے بارہ میں نازل ہوئی تھی جن میں سے تین اس طرف تھے اور تین اس طرف۔

ضرب کاری لگائی کہ وہ اسے سہار نہ سکا، تڑپ کر گرا اور ختم ہو گیا[1] لیکن حضرت عبیدہ بھی شدید زخمی ہو گئے تھے، حضرت حمزہ اور علی انھیں اٹھا کر اسلامی کیمپ میں لے آئے، اس وقت درد و کرب کا یہ عالم تھا کہ ان کی کٹی ہوئی ران سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ لیکن اس پر بھی فکر تھی تو شہادت کی، رحمت عالم کے سامنے آئے تو سر حضور کے قدموں پر رکھ دیا اور عرض پرداز ہوئے: یارسول اللہ! میں ان زخموں سے مرگیا تو شہادت کا درجہ ملے گا؟ سرورِ کائنات نے فرمایا: کیوں نہیں! ضرور! اب ان میں امنگ پیدا ہوئی اور فخر سے بولے: آج اگر ابوطالب مجھے دیکھ لیتے تو انھیں معلوم ہوجاتا کہ ان کے اس شعر کا مصداق میں ہوں:

ونُسلِمہٗ حتیٰ نُصَرَّعَ دُونَہٗ ونذھل عن ابنائنا والحلائل

ترجمہ: ہاں! اے اہل قریش! ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس وقت تک تمہارے حوالہ نہیں کریں گے جب تک ہم سب ان کی مدافعت کرتے ہوئے بچھڑ کر گر نہیں پڑیں گے اور اپنی آل اولاد اور بیویوں سے غافل نہیں ہوجائیں گے، آخر زخموں کی تاب نہ لا کر جب مسلمان مدینہ لوٹ رہے تھے وادی الصفراء میں وہ جان بحق ہو گئے۔

اس کے بعد عبیدہ جو سعید بن العاص کا بیٹا تھا بڑی آن بان سے صف سے باہر نکلا اور پکار کر بولا: "میں ابوذات الکرش ہوں" اس کے جواب میں ادھر سے حضرت زبیر آگے بڑھے اور جنگ شروع ہو گئی۔ عبیدہ زفرق تا بقدم خود اور زرہ بکتر میں غرق تھا، صرف اس کی آنکھیں نظر آرہی تھیں، اس لئے حضرت زبیر نے اس کی آنکھوں پر اس زور اور قوت سے نیزہ مارا کہ بلبلا کر زمین پر گرا اور مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا، نیزہ اس بری طرح

---

[1] معلوم نہیں اس موقع پر بغیر حوالہ کے مولانا شبلی نے یہ کہاں سے لکھ دیا کہ شیبۃ کو حضرت علی نے قتل کیا تھا۔ حالانکہ یہ چیز اصول مبارزت کے خلاف تھی۔

سر میں پیوست ہوا تھا کہ حضرت زبیر نے مقتول نعش پر پاؤں رکھ کر اسے پوری قوت سے کھینچا تو نکلا تو سہی، لیکن اس کے دونوں کنارے خمیدہ ہوگئے، یہ نیزہ کمال شجاعت و مردانگی کا نشان تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حضرت زبیر سے طلب کر کے اپنے پاس رکھ لیا، آپ کے بعد یہ خلفائے راشدین میں دست بدست منتقل ہوتا رہا اور پھر حضرت زبیر کے خاندان میں آگیا[1]

حملۂ عام ولید، عتبہ، شیبہ اور عبیدہ جو یکے بعد دیگرے مارے گئے بڑے بہادر اور نامور ان قریش تھے ان کے قتل ہوجانے پر قریش آپے سے باہر ہو گئے اور حملۂ عام کی تیاری کرنے لگے، ادھر غیر معمولی جوش وخروش اور کشمکش کے باعث اسلامی لشکر کی صفوں میں یک گونہ بے ترتیبی پیدا ہوگئی تھی اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، صفوں کو مرتب ومنظم کیا اور پھر حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر عریشہ میں لوٹ آئے[2] اب لشکر قریش ایک سیل رواں کی طرح غصہ میں بھرے ہوئے اس طرح آگے بڑھے کہ چلتے جاتے اور تیروں کی بارش برساتے جاتے تھے، چونکہ ابھی فاصلہ پر تھے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے بموجب لشکر اسلام نے مضبوطی کے ساتھ اپنا مورچہ سنبھال لیا اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے، لیکن تیر اندازی نہیں کی، گویا مسلمانوں نے اس وقت دفاعی پوزیشن اختیار کر رکھی تھی۔ فرمان نبوی پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن نے جذبات سے بے قابو ہو کر دور سے جو تیر اندازی کی اور اس میں چابکدستی دکھائی تھی اس کے باعث لشکر اسلام کے قریب آتے آتے اس کے تیروں کا ایک بڑا ذخیرہ بیکار گیا اور وہ خود تازہ دم بھی نہیں رہا۔ اس کے برخلاف جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے قریب آئے تو مسلمانوں

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ بدر

[2] الاستدلال بن عبد البر

نے تازہ دم تیراندازی کی جو یقیناً بے اثر نہیں رہ سکتی تھی، اس کے بعد دونوں لشکر ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے تو فضا میں یکایک تلواریں اور نیزے اس طرح چمکنے لگے جیسے بادلوں میں بجلی، بلا کا رن پڑا اور غضب کا معرکہ بپا تھا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کمال خشوع وتضرع کا عالم طاری تھا۔ بار بار ہاتھ اٹھاتے اور فرماتے تھے: اَللّٰھم انشدک عھدک ووعدک، اللّٰھم ان شئت لم تعبد" ترجمہ: "اے اللہ! میں تجھکو تیرا وعدہ اور عہد یاد دلاتا ہوں۔ اے اللہ! اگر تو نے کچھ اور چاہا ہے تو پھر تیری عبادت نہ کی جائے گی۔" صحیح بخاری باب غزوۂ بدر میں حضرت ابن عباس سے صرف اتنے ہی الفاظ منقول ہیں، لیکن مسند احمد بن حنبل میں اور بعض اور مآخذ میں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ رو ہوئے، دست مبارک دراز کئے اور کہنا شروع کیا: "اے اللہ! کہاں ہے وہ جس کا تو نے وعدہ کیا تھا، اے اللہ! تو نے جس چیز کا مجھ سے وعدہ کیا تھا اب اسے پورا فرما۔ اے اللہ! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت قلیلہ ہلاک ہو گئی تو پھر دنیا میں کوئی تیری عبادت کرنے والا نہ ہوگا۔" حضرت عمر جو اس کے راوی ہیں ان کا بیان ہے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بار بار گڑگڑا گڑگڑا کے (یستغیث ربہ) یہ الفاظ کہتے جاتے اور دعا مانگتے جاتے تھے، یہاں تک کہ عالم بیخودی میں آپ کی چادر گر پڑی، حضرت ابو بکر نے یہ دیکھا تو پاس آئے، چادر اٹھا کر جسم اطہر پر ڈالی اور سرور کائنات کی پشت سے چمٹ کر بولے: "اے اللہ کے نبی بس کیجئے! آپ نے اپنے رب سے کافی عرض معروض کر دی، اس نے آپ سے جو وعدہ کیا تھا وہ اب پورا ہونے والا ہی ہے" بعض روایتوں میں ہے کہ دعا کرتے کرتے آپ ذرا سرنگوں ہو گئے اور اب جو سر اٹھایا تو زبان مبارک پر یہ ارشاد ربانی تھا:

سیھزم الجمع ویولون الدبر　　یہ لوگ عنقریب شکست کھائیں گے اور پسپا ہوں گے۔[1]

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ بدر، مگر اس میں سرنگوں ہونے کا ذکر نہیں ہے، ابن اسحٰق کے ہاں اس کا ذکر ہے۔

مسند امام احمد بن حنبل اور بعض اور کتب حدیث میں اس پر اتنا اضافہ اور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت زرہ پوش تھے، اسی حالت میں آپ فرط جوش سے اچھلتے جاتے اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے۔

اب میدان جنگ پر آپ نے نگاہ ڈالی تو یہاں کا نقشہ بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ قریش کا لشکر جو گھنگھور گھٹا کی طرح اُمڈ کر آیا تھا اب وہ چھٹنے لگا۔ غازیان اسلام نے شجاعت و مردانگی کے وہ جوہر دکھائے کہ ان کے چھکے چھوٹ گئے، فوج میں افراتفری پیدا ہو گئی، مسلمانوں کی تیغ و سنان کے پے بہ پے حملوں سے دشمن کی لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں یا وہ گرفتار ہو رہے تھے، اسی عالم میں عفرا کے دو نوخیز بیٹے معوذ اور معاذ ابوجہل کی تاک میں سرگرداں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کے پاس سے ان کا گذر ہوا تو دونوں نے چپکے سے ان کے پاس جا کر پوچھا: "چچا جان! کیا آپ ابوجہل کو پہچانتے ہیں" حضرت عبد الرحمٰن بن عوف بولے: ہاں میں اسے پہچانتا ہوں مگر بھتیجہ تم کرو گے کیا؟ ایک لڑکے نے جواب دیا: میں نے سنا ہے کہ یہ شخص رسول اللہ کی شان میں اول فول بکتا ہے، اس لئے میں نے قسم کھائی ہے کہ اگر دیکھ لوں گا تو اسے بچ کر نہیں جانے دوں گا۔ ایک جب یہ کہہ چکا تو پھر دوسرے بھائی نے بھی یہی بات کہی، عبد الرحمٰن بن عوف کہتے ہیں: ان دونوں بھائیوں کی کم عمری اور ان کا تن و توش دیکھ کر ان کے اس عزم پر مجکو بڑی حیرت ہوئی (حالانکہ بات حیرت کی نہ تھی، شمع اگر روشن ہو تو پروانہ کی عمر اور اس کے قد و قامت کا سوال چہ معنی دارد) اتنے میں ابوجہل چلتا پھرتا نظر آ گیا تو میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: لو دیکھو، وہ ہے ابوجہل۔ یہ سنتے ہی دونوں بھائی لپک کر وہاں پہونچے اور یک لخت اس پر جھپٹ کے دونوں نے تلوار کا ایسا وار کیا کہ ٹھنڈا ہو کر گر پڑا۔ بعد ازاں حضور نے ابوجہل کی خبر لانے کے لئے حضرت عبد اللہ بن مسعود کو بھیجا تو اس وقت تک اس میں رمق حیات باقی تھی، عبد اللہ بن مسعود نے رہا سہا اس کا کام تمام کر دیا اور آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مژدہ جا سنایا۔[۱]

عتبہ، شیبہ اور ولید ایسے نامورانِ قریش پہلے ہی قتل ہو چکے تھے، اب ابوجہل کے قتل نے رہے سہے حواس بھی ختم کر دیے اور لشکرِ قریش میں بھگدڑ مچ گئی، مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا، جو ہاتھ لگ گیا اسے سپردِ تیغ کر دیا یا گرفتار کر لیا، اب جو جنگ کا مطلع صاف ہوا تو معلوم ہوا کہ لشکرِ اسلام میں سے صرف چودہ مسلمان شہید ہوئے ہیں جن میں چھ مہاجر تھے اور آٹھ انصار۔ ان میں چھ قبیلۂ اوس سے تعلق رکھتے تھے اور دو خزرج کے تھے، اس کے بالمقابل ستر آدمی فریقِ مخالف کے مارے گئے اور ستر ہی گرفتار ہوئے۔ اب ہم ذیل میں تین فہرستیں نقل کرتے ہیں جن سے فریقین کے نقصانات کا اور اس جنگ کی تاریخی اہمیت کا صحیح اندازہ ہوگا۔

(۱)

شہدائے بدر

نمبر	نام	قبیلہ و کیفیت
۱	حضرت عبیدۃ بن الحارث بن المطلب	بنو المطلب بن عبد المناف قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، قریش کے مشہور شہسوار تھے، مکہ میں پیدا ہوئے، حضور رجب دار ارقم میں داخل ہوئے ہیں، اس سے

---

[۱] ارباب علم پر پوشیدہ نہیں ہے کہ قتل ابوجہل کے سلسلہ میں علما نے طول طویل بحثیں کی ہیں کہ معاذ بن عفراہیں یا ابن عمرو بن الجموح، پھر یہ کہ ابوجہل کا اصل قاتل کون ہے، وغیرہ وغیرہ، لیکن یہ بحثیں ہمارے دائرۂ کار سے خارج ہیں اس لئے ہم نے صرف صحیح بخاری اور مسند امام احمد بن حنبل کو سامنے رکھ کر کچھ اِس سے لیا اور کچھ اُس سے لیا اور اس طرح نفس واقعہ کا ایک خاکہ تیار کیا ہے۔

نمبر	نام	کیفیت
		پہلے اسلام لاچکے تھے، حضور سے عمر میں دس برس بڑے تھے، سلسہ میں ساٹھ آدمیوں کا جو دستہ بھیجا گیا تھا اس کے علمبردار یہی تھے۔
۲	حضرتؓ عمیر بن ابی وقاص	قبیلہ، بنو زہرۃ بن کلاب۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کے برادر خورد، شہادت کے وقت عمر سولہ یا سترہ برس تھی، حضور نے جب لشکر کا جائزہ لیا تو کم سنی کے باعث ان کو واپس کردینا چاہا یہ رونے لگے، اس پر حضور نے اجازت عطا فرمادی، یہ لڑے اور شہید ہوگئے۔
۳	" ذوالشمالین ابن عبد عمرو بن نضلۃ الخزاعی	حلیف بنی زہرہ۔ حافظ ابن عبد البر (الدرر) نے اس پر تنبیہ کی ہے کہ امام زہری تک کو یہ مغالطہ ہوگیا ہے کہ وہ ان کو وہی ذوالیدین سمجھ بیٹھے ہیں جن کی طرف حدیث سہو میں اَقُصِرَتِ الصلوۃ ام نسیت یارسول اللہ کہنا منسوب ہے حالانکہ یہ الگ الگ دو شخص ہیں، کیونکہ حدیث سہو کے راوی حضرت ابوہریرہ ہیں اور ان کا اسلام ذوالشمالین کی شہادت کے بعد کا ہے۔
۴	" عاقل بن البکیر	حلیف بنی عدی بن کعب بن لوئی۔ اسلام کے سابقین اولین میں سے تھے، دار ارقم میں حضور سے بیعت کی تھی، ان کا اصل نام غافل تھا، حضور نے اسے بدل کر عاقل کر دیا۔

۵	حضرت مہجعؓ	حضرت عمرؓ کے آزاد کردہ غلام۔ یہ بھی سابقین اولین میں سے تھے۔
۶	〃 صفوان بن بیضاء	قبیلۂ بنی الحارث بن فہر سے تھے۔
۷	〃 سعد بن خیثمہ انصاری	بنی عمرو بن عوف (خزرج کی ایک شاخ) سابقین اسلام میں سے ہیں، بیعت عقبہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بارہ نقیب منتخب کئے تھے ان میں ایک یہ بھی تھے، یہ نوجوان تھے، غزوۂ بدر میں شرکت کے لئے انھوں نے اور ان کے والد حضرت خیثمہ نے قرعہ اندازی کی تو حضرت سعد کا نام نکلا۔ باپ نے ہر چند کہا کہ بیٹے مجھے غزوہ میں جانے دے لیکن حضرت سعد نہ مانے اور بولے: ابا جان! اگر سودا جنت کے علاوہ کسی اور چیز کا ہوتا تو میں آپ کی بات مان لیتا چنانچہ گئے، بڑی بہادری سے لڑے اور شہید ہو گئے،
۸	〃 مبشر بن عبدالمنذر بن زنبر انصاری	قبیلہ خزرج، حضرت ابولبابہ کے بھائی تھے جن کو حضور نے مقام الروحاء سے مدینہ کا امیر بنا کر واپس کر دیا تھا۔
۹	〃 یزید بن الحارث انصاری	قبیلہ خزرج۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں اور حضرت ذوالشمالین میں مواخات کرائی تھی۔
۱۰	〃 عمیر بن الحمام انصاری	قبیلہ خزرج کی شاخ بنی سلمہ، یہ وہی ہیں جن کا تذکرہ مضمون میں آچکا ہے کہ کھجور کھاتے کھاتے

		انھیں پھینک دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور شہید ہو گئے۔
۱۱	” رافع بن المعلی انصاری	قبیلۂ خزرج ، ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کے ہاتوں شہید ہوئے
۱۲	” حارثہ بن سراقہ انصاری	قبیلۂ اوس کی شاخ بنی النجار۔
۱۳	” عوف بن الحارث	”اوس“ کی شاخ بنی غنم سے تھے ، دونوں بھائی تھے اور نوجوان ! ابنا عفرا کے لقب سے مشہور ہیں
۱۴	” معوذ بن الحارث	

ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں: ”ان شہدائے بدر کا مقبرہ ایک ممتاز احاطے میں آج بھی موجود ہے ، ترکوں کے زمانہ میں یہاں سنگ مرمر کے ستون اور کتبے وغیرہ لگائے گئے تھے۔ مگر اب یہ کھنڈر ہو چکے ہیں۔

(۲)

مقتولین بدر

۱	عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس	قریش کی شاخ عبد مناف
۲	شیبہ بن ربیعہ بن عبد شمس	”
۳	ولید بن عتبہ	”
۴	حنظلہ بن ابی سفیان بن حرب	”
۵	الحارث بن الحضرمی	”
۶	عامر بن الحضرمی	”
۷	عمیر بن ابی عمیر	”
۸	عمیر کا بیٹا	”

۹	عبیدہ بن سعید بن العاص	قریش کی شاخ عبد مناف
۱۰	العاص بن سعید بن العاص	”
۱۱	عقبہ بن ابی معیط	”
۱۲	عامر بن عبد اللہ النمری	بنی عبد شمس بن عبد مناف کا حلیف
۱۳	حارث بن عامر بن نوفل	بنی نوفل بن عبد مناف
۱۴	طعیمہ بن عدی بن نوفل	”
۱۵	زمعہ بن الاسود بن المطلب	بنی اسد بن عبد العزی
۱۶	ابو البختری بن ہشام	”
۱۷	حارث بن زمعہ	”
۱۸	نوفل بن خویلد بن اسد	” یہ حضرت خدیجہ کا بھائی، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا برادر نسبتی تھا، لیکن نہایت سرکش اور حضور کی جان کا دشمن
۱۹	عقیل بن الاسود بن المطلب	”
۲۰	عقبہ بن زید	یمن کا باشندہ اور بنی اسد کا حلیف
۲۱	عمیر	بنی اسد کا غلام
۲۲	النضر بن الحارث بن کلدہ	بنی عبد الدار بن قصی، یہ لشکر قریش کا علمبردار تھا، نہایت بدطینت اور کمینہ فطرت انسان تھا، مکہ کے زمانۂ قیام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذارسانی میں پیش پیش رہتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کو حضرت علی نے مدینہ واپس جاتے ہوئے وادی صفرا کے

نمبر	نام	تفصیل
		مقام اثیل میں قتل کیا۔
۲۳	زید بن ملیص	بنی عبد الدار بن قصی
۲۴	نبیہ بن زید بن ملیص	حلیف بنی عبد الدار، اول بنو مازن اور پھر بنو تمیم سے۔
۲۵	عبید بن سلیط	حلیف بنی عبد الدار، قبیلہ قیس
۲۶	مالک بن عبیداللہ بن عثمان	بنی تیم بن مرہ، یہ جنگ میں قتل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ گرفتار ہوا اور اسی حالت میں مرگیا۔
۲۷	عمرو بن عبداللہ بن جدعان	بنی تیم بن مرہ
۲۸	عمیر بن عثمان	〃
۲۹	عثمان بن مالک	〃
۳۰	ابوجہل بن ہشام	بنی مخزوم، لشکر قریش کا کمانڈر ان چیف اسلام کا اور حضور کا شدید ترین دشمن۔
۳۱	عاص بن ہشام بن المغیرہ	بنی مخزوم !
۳۲	یزید بن عبداللہ	حلیف بن مخزوم، بنو تمیم قبیلہ،
۳۳	ابو مسافع الاشعری	〃
۳۴	حرملہ بن عمرو	〃
۳۵	مسعود بن ابی امیہ	بنی مخزوم، حضرت ام سلمہ زوجۂ حضور کا بھائی
۳۶	ابو قیس بن الولید	〃 حضرت خالد بن الولید کا بھائی
۳۷	ابو قیس بن الفاکہۃ بن المغیرہ	بنی مخزوم
۳۸	رفاعہ بن عابد بن عبداللہ	〃
۳۹	منذر بن ابی رفاعہ بن عابد	〃

نمبر	نام	قبیلہ / کیفیت
۴۰	سائب بن ابی السائب بن عابد	بنی مخزوم ۔ لیکن ابن ہشام ج ۲ ص ۳۷۶ میں ہے کہ یہ قتل نہیں ہوئے بلکہ بعد میں مسلمان ہوگئے تھے اور حضور نے حنین کے مال غنیمت میں سے ان کو حصہ دیا تھا۔ ابن عبد البر نے بھی مقتولین کی فہرست میں ان کا نام لکھنے کے بعد لکھا ہے وقد قیل لم یقتل السائب یومئذٍ بل اسلم بعد ذالک ۔ ص ۱۱۸ واللہ اعلم
۴۱	اسود بن عبد الاسد	بنی مخزوم
۴۲	حاجب بن السائب بن عویمر	"
۴۳	عویمر بن السائب بن عویمر	"
۴۴	عمرو بن سفیان	حلیف بنی مخزوم ، قبیلہ طے
۴۵	جابر سفیان	" "
۴۶	عبد اللہ بن المنذر بن ابی رفاعہ	بنی مخزوم
۴۷	حذیفہ بن ابی حذیفہ	"
۴۸	ہشام بن ابی حذیفہ	"
۴۹	زہیر بن ابی رفاعہ	"
۵۰	السائب بن ابی رفاعہ	"
۵۱	عائذ بن السائب بن عویمر	"
۵۲	عمیر	حلیف بنی مخزوم قبیلہ طے

۵۳	خیار	حلیف بنی مخزوم
۵۴	منبہ بن الحجاج بن حذیفہ	بنی سہم بن عمرو، حضرت عمرو بن العاص کا قبیلہ
۵۵	عاص بن منبہ بن الحجاج	〃
۵۶	نبیہ بن الحجاج	〃
۵۷	ابو العاص بن قیس بن عدی	〃
۵۸	عاصم بن خبیرہ بن سعید	〃
۵۹	حارث بن منبہ بن الحجاج	〃
۶۰	عامر بن بن عوف بن خبیرہ	〃
۶۱	معاویہ بن عامر	بنی عامر بن لوئی
۶۲	معبد بن وہب	حلیف بنی عامر، قبیلہ بنی کلب بن عوف
۶۳	امیہ بن خلف	بنی جمح بن عمرو بن ھصیص، یہی وہ شخص ہے حضرت بلال جس کے غلام تھے اور جو ان کے قبول اسلام کی پاداش میں انھیں سخت ترین ایذائیں دیتا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر نے انھیں خرید کر آزاد کیا۔
۶۴	علی بن امیہ بن خلف	امیہ کا بیٹا
۶۵	اوس بن معیر بن لوذان	بنی جمح بن عمرو بن ہصیص
۶۶	سبرہ بن مالک۔	حلیف بنی جمح بن عمرو بن ہصیص
۶۷و۶۸	دو نامعلوم الاسم غلام	بنی عبد شمس
۶۹و ۷۰	ان کے ناموں اور قبیلہ کا پتہ نہیں لگا۔	

باقی

عہدِ نبوی کے غزوات و سرایا
اور
ان کے مآخذ پر ایک نظر

(۱۰)

سعید احمد اکبرآبادی

(۳) اسیرانِ بدر

نمبر	نام	قبیلہ و کیفیت
۱	عباس بن عبدالمطلب	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور عمر میں دو برس بڑے تھے، اپنا فدیہ دے کر مکہ واپس چلے گئے، فتح مکہ سے کچھ پہلے مدینہ آ گئے، اسلام قبول کیا اور فتح مکہ اور حنین کے معرکوں میں شریک ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چچا کا بہت خیال رکھتے تھے، ایک موقع پر فرمایا: "جو شخص عباس کو اذیت دے گا وہ مجکو اذیت دے گا" ۳۲ھ میں مدینہ میں وفات پائی، قبیلہ بنو ہاشم۔
۲	عقیل بن ابی طالب	بنو ہاشم، حضرت علی کے بھائی اور حضور کے برادرِ عم زاد تھے، فتح مکہ کے سال مسلمان ہوئے اور حنین اور موتہ

۱۶	خالد بن اسید بن ابی العیص	بنی عبد شمس، حضرت عتاب بن اسید جن کو فتح مکہ کے بعد حضور نے وہاں کا امیر بنایا تھا، ان کے بھائی، فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا۔
۱۷	ابو العریض، یسار	بنی عبد شمس، العاص بن امیہ کا غلام۔
۱۸	عدی بن الخیار بن عدی بن نوفل	قبیلہ بنو نوفل بن عبد مناف
۱۹	عثمان بن شمس	بنو نوفل کا حلیف، بنو مازن بن منصور سے۔
۲۰	ابو ثور	"
۲۱	نبہان	بنو نوفل کا غلام
۲۲	ابو عزیز بن عمیر بن ہاشم	قبیلہ بنو عبد الدار بن قصی، حضرت مصعب بن عمیر کا بھائی۔
۲۳	اسود بن عامر	بنو عبد الدار کا حلیف
۲۴	عقیل، ایک یمنی باشندہ	"
۲۵	سائب بن ابی حبیش	قبیلہ بنو اسد بن عبد العزیٰ
۲۶	حویرث بن عباد	"
۲۷	سالم بن شماخ	حلیف بنو اسد بن عبد العزیٰ
۲۸	عبد اللہ بن حمید بن زہیر	قبیلہ بنو اسد بن عبد العزیٰ
۲۹	خالد بن ہشام بن المغیرہ	قبیلہ بنو مخزوم بن یقظہ
۳۰	امیہ بن ابی حذیفہ بن المغیرہ	"
۳۱	عثمان بن عبد اللہ بن المغیرہ	"
۳۲	ابو المنذر بن ابی رفاعہ	"
۳۳	ابو عطاء، عبد اللہ بن السائب	"

نمبر	نام	کیفیت
۳۴	مطلب بن حنطب بن الحارث	قبیلہ بنو مخزوم بن یقظہ
۳۵	خالد بن الاعلم الخزاعی	قبیلہ بنی مخزوم بن یقظہ کا حلیف، کہتے ہیں غزوہ میں سب سے پہلے جس شخص نے فرار اختیار کیا وہ یہی تھا۔ حالانکہ اس کا شعر ہے: ولسنا علی الاعقاب تدمی کلومنا ولکن علی اقدامنا یتقطو الدم "ہم وہ نہیں ہیں جن کی ایڑیاں زخم خوردہ ہو کر خون آلودہ ہوں، البتہ، ہاں ہمارے پنجوں پر خون ٹپکتا رہتا ہے۔"
۳۶	ولید بن ولید بن المغیرہ	قبیلہ بنی مخزوم، حضرت خالد بن الولید کا بھائی۔
۳۷	سیفی بن ابی رفاعہ بن عابد	"
۳۸	قیس بن السائب	"
۳۹	ابورواعۃ بن جنیرہ	قبیلہ بنو سہم بن عمرو بن ہصیص
۴۰	وفرۃ بن قیس بن عدی	"
۴۱	حنظلۃ بن قبیصۃ	"
۴۲	حجاج بن قیس بن عدی	"
۴۳	اسلم	" نبیہ الحجاج کا غلام
۴۴	عبداللہ بن ابی خلف	قبیلہ بنو جمح بن عمرو بن ہصیص
۴۵	ابوعزۃ عمرو بن عبد بن عثمان	"
۴۶	الفاکہۃ	" امیہ بن خلف کا غلام
۴۷	وہب بن عمیر	"
۴۸	ربیعہ بن دراج	"

۴۹	عمرو بن ابی بن خلف	قبیلہ بنو جمح بن عمرو بن ہصیص
۵۰	ابو رہم بن عبداللہ	حلیف قبیلہ
۵۱	ایک نامعلوم الاسم شخص	ابن اسحٰق اس شخص کا نام بھول گئے ۔ مگر تھا یہ بھی قبیلہ بنو جمح بن عمرو بن ہصیص سے
۵۲	نسطاس	امیہ بن خلف کا غلام
۵۳	امیہ بن خلف کا ایک اور غلام	اس کا نام بھی معلوم نہیں ہوسکا ۔
۵۴	ابو رافع	امیہ بن خلف کا لڑکا
۵۵	سہیل بن عمرو	قبیلہ بنو عامر بن لوئی
۵۶	عبد بن زمعہ بن قیس	"
۵۷	عبدالرحمٰن بن منشوٴ بن وقدان	"
۵۸	حبیب بن جابر	"
۵۹	سائب بن مالک	"
۶۰	طفیل بن ابی قنیع	قبیلہ بنو الحارث بن فہر
۶۱	عتبہ بن عمرو بن جحدم	"
۶۲	شافع	حلیف بنو الحارث بن فہر، یمن کا باشندہ
۶۳	شفیع	" "
۶۴	مالک بن عبیداللہ	حضرت طلحہ کا بھائی ، بحالت اسارت ہی انتقال ہوا ۔
۶۵	حذیفہ بن ابی حذیفہ بن المغیرہ	قبیلہ بنی مخزوم بن یقظہ
۶۶	حکم بن المطلب بن عبداللہ بن المطلب	" مسلمان ہوگئے تھے ، بے حد سخی اور زاہد شخص تھے ، جب انتقال ہوا تو ایک شاعر

		نے ان کے مرثیہ میں کہا : سألوا عن الجود والمعروف ما فعلا فقلت انهما ماتا مع الحکم "لوگوں نے سخاوت اور کرم کے متعلق پوچھا کہ ان کا کیا حال ہے ؟ تو میں نے کہا کہ حکم کے ساتھ یہ دونوں بھی مرگئے ہیں۔
۶۷	ابوالعاص بن نوفل بن عبد شمس	قبیلہ عبد شمس بن عبد مناف

نوٹ : اسیران بدر کی تعداد ستر بتائی جاتی ہے، لیکن تین کا مجھے پتہ نہیں لگا۔

اب ان تینوں فہرستوں کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ دونوں فریق کے نقصانات میں کس درجہ عظیم اور زمین آسمان کا فرق ہے، مسلمانوں میں لے دیکے صرف چودہ جانوں کا نقصان ہوا ہے، گرفتار کوئی ایک بھی نہیں ہوا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جنگ کی شدت اور اُس کی ہیبت سے گھبرا کر ایک شخص نے بھی راہ فرار اختیار نہیں کی اور جو جانی نقصان ہوا بھی ہے تو اُس کی صورت یہ ہے کہ ان میں ایک وہ مرد جانباز ہے جو جذبۂ شہادت کے جوش میں جنگی ڈسپلن کی پروا کئے بغیر تن تنہا فریق مخالف کی صفوں میں درانہ گھسا ہوا چلا گیا اور شہید ہوگیا، اس کے علاوہ تین وہ لڑکے ہیں جو نوخیز اور کمسن تھے۔ انھیں جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور محض اپنی ضد اور شوق سے یہاں چلے آئے تھے، اللہ اکبر! یہ کارنامہ ان لوگوں کا ہے جن کو اس واقعہ کے کئی برس بعد مکہ میں دیکھ کر اہل مکہ نے بہ طور طعن و تمسخر کہا تھا: "اوھنتہم حمی یثرب" "یثرب کے بخار نے ان کو کمزور کر دیا ہے" جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو طواف میں رمل یعنی سینہ تان کر چلنے کا حکم دیا تھا۔

اس کے برعکس دوسری جانب دیکھئے تو وہ تباہی آئی ہے کہ خدا کی پناہ! ایک قبیلہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے لوگ قتل یا گرفتار نہ ہوئے ہوں۔ فہرستوں پر نگاہ ڈالئے

قریش کے بیس سے زیادہ نامور بہادر اور سردار سپرد تیغ ہو گئے۔ کتنے ہی ہیں جو اُن میں گرفتار ہوئے، بعض گھرانے تو وہ ہیں جن کا بالکل ہی صفایا ہو گیا، ہبار بن الاسود الاسدی کے تین بھائی تھے وہ سب جنگ میں کام آ گئے، ہند بنت عتبہ پر یہ قیامت ٹوٹی کہ اس کا باپ عتبہ، اس کا چچا شیبہ، اس کا بھائی ولید، اس کا چچیرا بھائی عبیدہ بن سعید بن العاص بن امیہ اور اس کے شوہر کا لڑکا حنظلہ بن ابی سفیان بن حرب، یہ سب لوگ مارے گئے، پروفیسر واٹ منٹگمری لکھتے ہیں کہ "جس قابلیت اور تجربہ کے لوگ جنگ میں آ گئے ان جیسے مشکل سے ایک درجن لوگ مکہ میں زندہ بچے ہوں گے" (ص ۱۴۲[1]) اس بنا پر ہزیمت اور شکست سے چور یہ لشکر مکہ واپس پہونچا تو گھر گھر میں ماتم بپا ہو گیا، از راہ غیرت قریش نے تاکید کر دی تھی کہ نالہ و شیون اور آہ و بکا کی آواز کسی گھر سے باہر نہ نکلے۔ مگر دل پر کیا جبر ہو سکتا ہے، عورتوں نے مرثیے پڑھے اور رجز خوانی کر کے مردوں کو لعن طعن کیا۔ چنانچہ حضرت زینب (بنت الرسول) کی مکہ سے روانگی کو قریش نے اپنے لئے ننگ و عار کی بات قرار دیا تو ہند بنت عتبہ نے جس کا ذکر آ چکا ہے بہ طور طنز کہا:

افی السلم اعیارٌ، جفاءً و غِلْظَۃً

وفی الحرب اشباہ النساء العوارک[2]

ترجمہ: "جب جنگ نہ ہو تو تم کو از راہ سنگدلی و درشتیٔ طبع بڑی غیرت آتی ہے، لیکن جنگ کا موقع ہو تو تم لڑاکا اور جھگڑالو عورتوں جیسے بن جاتے ہو۔"

۱۔ اور یہ لوگ بھی وہ تھے جو ابوسفیان، صفوان بن امیہ بن خلف الجمحی اور ابولہب کی طرح جنگ میں شریک ہی نہیں ہوئے تھے۔

۲۔ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۱۰

مدینہ میں مسرت اور اطمینان کی لہر

ایک طرف مکہ ماتم کدہ بنا ہوا تھا اور دوسری جانب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعیان قریش کی لاشوں کو دفن کرانے کے بعد دو تیز رفتار قاصدوں[1] کے ہاتھ مژدۂ فتح مدینہ پہونچایا تو گھر گھر اطمینان ومسرت کی لہر دوڑ گئی، اگرچہ یہ عجیب اتفاق تھا کہ قاصد جب مدینہ میں داخل ہوئے ہیں تو انھوں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہ جو حضرت عثمان کی اہلیہ تھیں اور جن کی علالت کے باعث حضرت عثمان غزوۂ بدر میں بحکم نبوی شریک نہ ہو سکے تھے اُن کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کا جنازہ تدفین کے لئے لایا جا رہا ہے، ان دو پیغام رسانوں میں ایک حضرت زید بن حارثہ بھی تھے، مدینہ میں یہود اور منافقین نے جنگ کے انجام کے بارہ میں نہایت بری اور مایوس کن افواہیں اس شدت سے پھیلا رکھی تھیں کہ جب یہ دونوں پیغام رساں پہونچے اور انھوں نے فتح وکامرانی کا اعلان عام کیا تو حضرت زید کے صاحبزادہ حضرت اسامہ نے رازدارانہ طور پر باپ سے پوچھا: ابا جان! جو کچھ فرما رہے ہیں کیا سچ مچ یہ واقعہ بھی ہے، ؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے بعد تین دن مزید بدر میں قیام فرمایا۔ اس کے بعد جب آپ مع اپنے لشکر اور قیدیوں کے روانہ ہوئے ہیں تو حال یہ تھا کہ مختلف منزلوں پر مسلمانوں کے وفود ملتے رہے جنھوں نے آپ کا استقبال کیا اور فتح وکامرانی پر مبارک باد پیش کی۔

اسیرانِ بدر کے ساتھ معاملہ

قیدیوں میں سے دو شخص، نضر بن الحارث اور عقبہ بن ابی معیط جو اسلام کے نہایت سخت دشمن تھے اور جنھوں نے مکہ میں حضور کو اور مسلمانوں کو شدید ایذائیں پہونچائی تھیں قتل کر دیے گئے، باقی قیدیوں کے بارہ

---

[1] حضرت زید بن حارثہ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ،

میں حکم ہوا کہ ان کی بندشیں ڈھیلی کر دی جائیں اور انھیں کھانے پینے کی یا کوئی اور اذیت نہ دی جائے۔ جب حالات ٹھیک ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے مشورہ کیا کہ قیدیوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ قتل کر دیے جائیں اور وہ بھی اس طرح کہ ہر شخص اپنے عزیز قریب کے ہاتوں قتل ہو" اس کے برخلاف حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: یارسول اللہ! یہ لوگ آپ کے ہی کنبہ قبیلہ کے ہیں، ان کو ہلاک نہ کیجئے، ممکن ہے کل یہ مسلمان ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ ان کے سب گناہ معاف کر دے۔ آپ ان سے جو فدیہ لیں گے وہ ہماری تقویت کا باعث ہوگا[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی رائے کو صائب قرار دیا لیکن ترجیح حضرت ابو بکرؓ کی رائے کو دی، چنانچہ بعض قیدی جو بے ضرر تھے یا غربت کے باعث زرِ فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے انھیں کسی معاوضہ کے بغیر رہا کر دیا گیا، باقی لوگوں کے لئے چار ہزار درہم فی کس کی رقم زرِ فدیہ مقرر کی گئی، حضور کو تعلیم اور ہتیار مہیا کرنے کا کس درجہ اہتمام تھا؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ نوفل بن الحارث بن عبدالمطلب جو اسلحہ فروشی کا کاروبار کرتا تھا اُس سے زرِ فدیہ میں ایک ہزار نیزے طلب کئے گئے اور قیدیوں میں جو لوگ لکھے پڑھے تھے ان کا فدیہ یہ قرار دیا گیا کہ وہ دس دس بچوں کو نوشت و خواند کی تعلیم دیں[2]۔

ایک آیت کا مطلب قرآن مجید کی سورۃ الانفال میں ایک آیت ہے:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ، تُرِيدُونَ	کسی نبی کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اس سے پہلے کہ زمین میں غلبہ حاصل کرے، قیدیوں سے

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱۴ باب اساری بدر

[2] سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد و مسند امام احمد بن حنبل

عَرَضَ الدُّنْيَا ، وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ، وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ سروکار رکھے، تم دنیا کے مال ومتاع کا ارادہ کرتے ہو حالانکہ اللہ آخرت کو مطلوب رکھتا ہے اور اللہ اپنے ارادوں میں غالب اور حکیم ہے۔

یہ واضح رہنا چاہیئے کہ ہم نے اپنی کتاب الرق فی الاسلام میں اس آیت پر اس درجہ بسط و تفصیل سے کلام کیا ہے کہ حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے پڑھا تو نہایت مسرور ہوئے، دعائیں دیں اور فرمایا: "تم نے تحقیق کی انتہا کر دی ہے، کوئی شخص اس سے زیادہ کیا لکھ سکتا ہے۔" بہرحال مقام کی مناسبت سے اس سلسلہ میں مختصراً عرض یہ کرنا ہے کہ اس آیت کے سبب نزول سے متعلق حضرت عمر کی ایک روایت ہے جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے، اس کے کچھ ٹکڑے ابوداؤد اور ترمذی میں بھی ہیں، واحدی نے "اسباب النزول" میں پوری طول طویل روایت نقل کر دی ہے، اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عمر فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس روز حضرت ابوبکر اور مجھ سے مشاورت کے بعد اسیران بدر سے متعلق فیصلہ کیا ہے، اس کے دوسرے دن میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضور اور حضرت ابوبکر دونوں گریہ کر رہے ہیں، میں نے دریافت کیا: یارسول اللہ! آپ مجھے بتائیے کہ رونے کی وجہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا: تمہارے ساتھیوں نے قیدیوں کے بارہ میں فدیہ لینے کا جو مشورہ دیا تھا، میں اُس پر رو رہا ہوں، مجھ پر اس درخت سے بھی قریب ایک عذاب دکھایا گیا تھا، اور اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اس روایت کی روشنی میں اکثر علمائے تفسیر و روایت اور ان کے تتبع میں ارباب تاریخ وسیر نے مذکورۂ بالا آیت کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کے بارہ میں حضرت عمر کا مشورہ رد کر کے حضرت ابوبکر کی رائے کے مطابق عمل کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا، اس آیت میں اُس پر عتاب ظاہر کیا گیا ہے، یعنی خدا کا منشا یہ ہی تھا کہ حضرت عمر کی

رائے کے مطابق اسیرانِ بدر کو قتل کر دیا جاتا اور فدیہ دے کر انھیں رہا نہ کیا جاتا۔

لیکن اس آیت سے جو مطلب نکلتا ہے وہ یہی ہے کہ جب تک اثخان فی الارض حاصل نہ ہو جائے، قیدیوں سے سروکار نہ رکھنا چاہئے اور جب اثخان فی الارض حاصل ہو جائے تو اب پیغمبر کو اختیار ہے کہ قیدیوں کے ساتھ من کا معاملہ کرے یا فدا کا۔ اب سوال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بدر میں جو عظیم الشان فتح حاصل ہوئی اس کو اثخان فی الارض (غیر مشکوک غلبہ) کہا جائے گا یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے اور یقیناً اثبات میں ہے تو پھر اگر حضور قیدیوں کے ساتھ من اور فدا کا معاملہ اب اس وقت کر رہے ہیں تو اس میں عتاب کی کیا بات ہے؟ اس بنا پر حقیقت یہ ہے کہ آیت میں کہیں اس کا اشارہ بھی نہیں ہے کہ قیدیوں کے قتل نہ کرنے اور ان کے ساتھ من وفدا کا معاملہ کرنے پر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا ہو۔

پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ حضور نے قیدیوں کے ساتھ جو حسنِ سلوک کیا اُس سے اسلام کو کس درجہ اہم اور عظیم فائدہ پہونچا۔ حضرت عباس، حضرت عقیل، حضرت ابوالعاص بن ربیع کی طرح کتنے لوگ مسلمان ہو گئے اور انھوں نے اسلام کی قابل قدر خدمات انجام دیں، چار ہزار درہم فی کس زرِ فدیہ وصول کر کے بیت المال میں کتنا اضافہ ہوا، مسلمانوں کے کتنے بچے لکھنا پڑھنا سیکھ گئے، پس جب حضور کا عمل اتنے فوائد کا حامل ہو تو اس کو خدا کی نظر میں کیونکر ناپسندیدہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آیت کا لہجہ عتاب کا ہے لیکن اول تو عتاب کا رُخ حضور کی طرف نہیں بلکہ اُن صحابہ کی طرف ہے جنھوں نے جنگ کے ختم ہونے کے فوراً بعد غنیمت میں اپنے حصہ کا سوال اٹھا دیا تھا اور پھر عتاب اس پر ہرگز نہیں ہے کہ قیدی قتل کیوں نہیں کئے گئے، بلکہ اس پر ہے کہ غنیمت کی اجازت ملنے سے پہلے ہی کیوں پیغمبر سے مال غنیمت کی تقسیم کا مطالبہ کیا گیا، چنانچہ آیت کے متن اور اس کے سیاق سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آیت میں فرمایا گیا: تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ، تم دنیوی مال ومتاع کا

ارادہ کرتے ہو اور اللہ آخرت کا ارادہ کرتا ہے، ظاہر ہے عَرَضَ الدُّنیا کا مصداق مالِ غنیمت ہو سکتا ہے نہ کہ قیدیوں کا زرِ فدیہ۔ کیونکہ زرِ فدیہ تقسیم نہیں ہوتا، بلکہ بیت المال (Treasury) میں جمع ہوتا ہے، پھر ارشاد ہوا: لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○ ترجمہ: تم نے جلد بازی میں جو کام کیا ہے اگر وہ پہلے سے اللہ کے ہاں منظور شدہ نہ ہوتا تو تم کو عذابِ عظیم سے واسطہ پڑتا۔ یہ کام جسے جلد بازی میں یہ لوگ کر بیٹھے کیا ہے؟ اس کے فوراً بعد جو آیت ہے اُس سے اس کا جواب نکلتا ہے۔ ارشاد ہے:

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

تو ہاں اب تم کو جو مالِ غنیمت ملا ہے اور وہ حلال وطیب ہے اسے کھاؤ، اور اللہ سے ڈرو (پھر ایسی غلطی نہ کرنا) بیشک اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے (جو غلطی تم سے ہو گئی ہے وہ اسے معاف کر دے گا)

اب دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھیے اور دیکھیے کہ ان سے مالِ غنیمت کا حکم کس طرح صاف صاف نکلتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہیئے کہ قرآن جس حکم کو "لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ" کہتا ہے وہ مالِ غنیمت کا حکم ہے یا قیدیوں کا؟ یقیناً وہ مالِ غنیمت کا حکم ہے کیونکہ اس میں اُن آیات کی طرف اشارہ ہے جن میں مالِ غنیمت کو حلال قرار دیا گیا ہے، مثلاً

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ الآیۃ

اور جان لو کہ جو کچھ تم کو مالِ غنیمت ملے گا اس کا ۱/۵ واں حصہ اللہ کے لئے ہو گا الآیۃ

قیدیوں کے بارہ میں اس طرح کا حکم کہیں کسی آیت میں نہیں ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں ترمذی میں جو روایت ہے اُس سے بعینہٖ وہی ثابت ہوتا ہے جو ہم نے لکھا ہے۔

اب سوال ہو سکتا ہے کہ اچھا! جب بات یہی ہے تو پھر آیت زیرِ بحث میں قیدیوں

کا ذکر کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر کلام بلیغ کے جزو ہوتے ہیں (۱) ایک ماسیق لہ الکلام یعنی کلام کا اصل مقصد اور (۲) دوسرا غیر ماسیق لہ الکلام۔ جس کا ذکر ضمنی طور پر کسی مصلحت سے کر دیا جاتا ہے، چنانچہ اس آیت میں بھی اصل ماسیق لہ الکلام مال غنیمت ہے اور قیدیوں کا ذکر، ان کا حکم بیان کرنے کی غرض سے ضمناً آ گیا ہے، اور اب پوری آیت کا مفہوم ہمارے لفظوں میں یہ ہوگا کہ "اے مسلمانو! ذرا پیغمبر کے قدم جمنے اور حالات کو سدھرنے تو دو! تم ابھی سے مالِ غنیمت اور قیدیوں کا معاملہ کہاں لے کر بیٹھ گئے، تمھاری جلد بازی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ تم دنیوی مال و متاع کا ہی دھیان رکھتے ہو حالانکہ پیغمبر کو تو اللہ کی زمین پر فتح پانی ہے اور خدا پیغمبر کی اعانت اور جہاد میں اس کی رفاقت کا بدلہ تم کو آخرت میں دے گا، تمھاری اس جلد بازی کی وجہ سے تم پر عذاب عظیم نازل ہوتا، مگر خیر اس لئے ہو گئی کہ اگرچہ تم سے جلد بازی کا قصور ضرور ہوا لیکن جس معاملہ میں تم نے جلد بازی کی وہ پہلے سے ہی اللہ کے ہاں منظور شدہ اور تمھارے لئے حلال اور طیب تھا۔

عہد نبوی کے غزوات و سرایا
اور
ان کے ماخذ پر ایک نظر

(۱۱)

سعید احمد اکبر آبادی

حبشہ میں مسرت غزوۂ بدر میں اسلامی لشکر کی فتح کی خبر دور دور پہونچی۔ چنانچہ البدایۃ والنہایۃ (ج ۳ ص ۳۰۸) میں ایک روایت ہے کہ شاہ حبش (نجاشی) کو اس کے ایک مخبر نے اس کی اطلاع دی تو نہایت مسرور ہوا اس نے فوراً حضرت جعفر بن ابی طالب اور ان کے رفقار کو بلاکر ان سے کہا کہ آپ لوگوں کو خوشخبری ہو۔ میرے ایک مخبر نے مجکو آکر بتایا ہے کہ بدر کے میدان میں ابھی حال میں ایک سخت جنگ ہوئی تھی، اس میں خدا نے اپنے نبی کی مدد کی اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کردیا۔ اور فلاں فلاں سردار مارے گئے، نجاشی اس وقت پھٹے پرانے کپڑے پہنے زمین پر بیٹھا تھا۔ حضرت جعفر نے پوچھا: "یہ کیا!" جواب دیا: "اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کے ذریعہ ہم کو بتایا ہے کہ تحدیث بالنعمۃ کا طریقہ یہ ہے، اللہ نے چونکہ اپنے نبی کو فتح دی ہے اس لئے میں اس کا شکرانہ اس طرح ادا کر رہا ہوں۔"

شعرا نے دونوں طرف کثرت سے اشعار اور قصائد لکھے جو سیرت ابن ہشام، البدایۃ والنہایۃ اور دوسری کتب سیر و مغازی میں منقول ہیں۔

اسبابِ فتحِ عظیم اب اس پر غور کرنا چاہیئے کہ اس عظیم الشان فتح کے اسباب کیا ہیں؟ قرآن مجید کے بیان کے مطابق اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے لگاتار فرشتے بھیجے تھے چنانچہ ارشاد ہے:

اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ فَاسْتَجَابَ لَکُمْ اَنِّیْ مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُرْدِفِیْنَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُکُمْ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝

(الانفال)

یاد کرو کہ جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، اس نے تمھاری فریاد سنی اور کہا: میں ایک ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کروں گا جو لگاتار آتے رہیں گے اور اللہ نے یہ صرف اس لئے کیا کہ تمھارے دلوں کو اطمینان اور خوشخبری ہو، اور فتح تو صرف اللہ کی دین ہے، بیشک اللہ اپنے ارادوں میں غالب اور حکیم ہے۔

لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ فرشتے امداد و نصرت خداوندی کی علامت ہیں۔ جیسا کہ مذکورۂ بالا آیت میں "وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ" سے ثابت ہے، اور پھر آیت میں یہ بھی فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ تمھاری مدد اس لئے کی تھی کہ تمھارے دلوں کو ڈھارس رہے اور تم پر بددلی طاری نہ ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر غزوۂ احد میں بھی تو یہی پیغمبر اور یہی مجاہدین تھے اور دشمن بھی یہی لوگ تھے، پھر وہاں فرشتوں کی مدد کیوں نہیں آئی اور مسلمان عروسِ کامرانی سے ہم کنار نہ ہو سکے؟

اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک سنت (دستور، قانون، طریقہ) ہے جس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ ارشاد ہے:

لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ۝ — تم ہرگز اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں پاؤ گے

لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِیْلًا ۝ — " " "

اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مدد انہیں لوگوں کی کرتا ہے جو اپنی مدد حسنِ تدبیر اور عملی جد و جہد کے

ذریعہ کرتے ہیں۔ قرآن میں ہے: "خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے"۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے: "انسان کو وہی چیز ملتی ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے" اور یہ ایک دو آیتیں کیا پورا قرآن ہی دعوتِ ایمان و عمل ہے۔ اسی مضمون کو اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں ہر کامیابی و ناکامیابی کے لئے دو قسم کے اسباب ہوتے ہیں ایک اسباب ظاہری اور دوسرے اسباب معنوی۔ انسانی سعی و عمل کا شمار اسباب ظاہری میں ہے اور خدا کی نصرت و مدد جس میں امورِ کوینیہ بھی شامل ہیں اسباب معنوی میں داخل ہیں۔ سنتِ الٰہی کے مطابق اسباب معنوی کا ظہور اسی وقت ہوتا ہے جبکہ انسان پہلے اپنے لئے اسبابِ ظاہری مہیا کرے۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا:

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔

یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ایک طرف مستشرقین ہیں جو اسباب مادی کے علاوہ کسی اور چیز کے قائل نہیں اور دوسری جانب بدقسمتی سے مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ ہے جس نے زندگی میں فتح و کامرانی اور حصول مراد و تمنا کا انحصار اسباب روحانی پر اٹھا کر رکھ دیا ہے۔

بدر میں فتح کے اسباب ظاہری حسب ذیل تھے:

ایمان و یقین

صحابہ کا اللہ اور یوم آخرت پر ایمان۔ اور اس بات کا یقینِ کامل کہ ان کی حیات اور موت سب رضائے رب کے لئے ہے، جامِ شہادت نوش کرتے وقت ان کے ہر بنِ مو سے جو صدا آتی تھی وہ یہی تھی کہ:

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس بنا پر ان کے دلوں میں تردد و تذبذب نہیں تھا بلکہ اپنے مقصد کی صداقت پر جزم و اذعان تھا اور ان میں باہم اتحاد اور یک جہتی تھی، ان کی یہی وہ صفت تھی جو نفسیاتی حیثیت سے دشمن کو مرعوب

اور ہیبت زدہ کر دیتی تھی، چنانچہ ایرانی فوج کے سپہ سالار (رستم) نے ان کو دیکھکر کہا تھا کہ جس قوم نے موت کو اپنا معشوق بنالیا ہو اسے کون شکست دے سکتا ہے، یہی وجہ تھی کہ غزوۂ بدر میں دشمن کثرتِ تعداد کے باوجود انھیں ایک مختصر فوج کی شکل میں نظر آیا اور اس کے برعکس یہ قلت تعداد کے باوصف دشمن کو بھاری بھرکم اور کثیر نظر آئے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِىْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا — اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ خدا تمھاری آنکھوں میں دشمن کی فوج کو کم دکھارہا تھا۔

اور اس کے برعکس:

يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ — دشمن مسلمانوں کو اپنے سے دگنا دیکھ رہے تھے۔

قریش میں بے یقینی اور تردد و تذبذب کی کیفیت

ایک طرف صحابہ میں ایمان و یقین اور عزم و ثبات کا یہ عالم تھا اور دوسری جانب قریش کا یہ حال تھا کہ ان کے سامنے چونکہ کوئی بلند نصب العین نہیں تھا۔ حضورؐ اور صحابہ کی بے لوث اور اعلیٰ اخلاق و بلند کردار کی زندگی کا ان کے نہاخانۂ قلب میں اعتراف موجود تھا اور جن سے وہ لڑنے جارہے تھے ان میں بہت سے لوگ انھیں کے بھائی بند اور رشتہ دار تھے۔ اس بناپر ابوجہل کے اکسانے پر یہ وقتی اور ہنگامی جوش میں مکہ سے تو چل پڑے، لیکن اُن کے دلوں میں بے یقینی اور تردد و تذبذب کی کیفیت تھی جس کا نتیجہ نفسیات کی اصطلاح میں بادلِ ناخواستہ بہادری (Reluctant Bravery) ہوتا ہے، چنانچہ جیسا کہ گذر چکا ہے، مکہ میں بعض لوگوں نے ابوجہل کی مخالفت کی، راستہ میں ایک قبیلہ کے لوگ اُس سے الگ ہوگئے اور جنگ کے شروع ہونے سے قبل بعض بااثر لوگوں نے اُس کو جنگ سے باز رہنے کی نہائش کی اور عتبہ بن ربیعہ نے اس موقع پر ایک نہایت پرزور خطبہ دیا[1]۔ اور دوسروں کا کیا ذکر! خود ابوجہل کے قلب میں

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۷۵

یک گونہ انفعالی کیفیت موجود تھی، بعض مورخین کا بیان ہے کہ اخنس بن شریق جو راستہ میں اپنے قبیلۂ بنو زہرہ کو لیکر لشکرِ مکہ سے الگ ہو گیا تھا، جنگ شروع ہونے سے پہلے بدر آیا اور ابوجہل سے تخلیہ میں یہ گفتگو کی۔

اخنس: اے ابوالحکم (ابوجہل کی کنیت) کیا واقعی تم محمد کو کاذب سمجھتے ہو!

ابوجہل: اللہ کے بارہ میں محمد کیونکر جھوٹ بول سکتے ہیں، حالانکہ ہم نے ان کا نام "الامین" رکھ چھوڑا تھا، انھوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا؛ لیکن بنی عبدمناف میں سقایت، رفادت، حجابت، اور مشورہ (مکہ سوسائٹی کے نہایت معزز امتیازات اور عہدے) یہ سب جمع ہو گئے ہیں، تو اب اگر نبوت بھی انھیں میں رہی تو ہمارے لئے کیا باقی رہے گا۔[1]

صحابہ کی شجاعت شجاعت اور دلیری میں قریش عرب میں ممتاز تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس موقع پر بھی انھوں نے اس کا مظاہرہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، بڑی ہمت اور جی داری سے لڑے، لیکن صحابہ نے جس انداز سے دادِ شجاعت و بہادری دی اور جس پامردی سے تعداد اور ساز و سامان دونوں میں اپنے سے کہیں برتر اور طاقتور حریف کا مقابلہ کیا ہے وہ ایمان و یقین اور ایک اعلیٰ نصب العین زندگی کے ساتھ والہانہ وابستگی کی روشن دلیل ہے، حضرت علی اور حضرت حمزہ کا حال تو یہ تھا کہ بجلی کی طرح کوندتے تھے، جس طرف کا رخ کر لیا، میدان صاف کر دیا، حضرت عُکّاشۃ بن محصن جو بنی عبدشمس بن عبدمناف میں سے تھے انھوں نے تیغ زنی کے وہ جوہر دکھائے کہ تلوار ٹوٹ گئی، حضور کو اطلاع ہوئی تو آپ نے ایک درخت کی جڑ اُن کو تھما دی اُن کے لئے یہ جڑ ہی تلوار تھی، اسی سے دشمن کا مقابلہ کرتے رہے، اس کا نام العون رکھا، جس غزوہ میں جاتے تھے اسے ساتھ رکھتے تھے۔[2]

---

[1] غزوۂ بدر محمد احمد باشمیل ص ۱۵۲

[2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۹۰

حضرت زبیر بن عوّامؓ کے کاندھے پر دو زخم اتنے بڑے اور گہرے تھے کہ ان کے صاحبزادہ حضرت عُروہؓ کا بیان ہے کہ میں بچہ تھا تو ان زخموں سے کھیلتا اور ان میں اپنی انگلیاں داخل کر دیتا تھا۔ یہ دونوں زخم انھوں نے غزوۂ بدر میں کھائے تھے، لیکن اس کے باوجود کثرت استعمال سے ان کی تلوار پر اتنے دندانے پڑ گئے تھے کہ وہ غزوۂ بدر کی یادگار کے طور پر محفوظ کر لی گئی اور خلفائے بنی امیہ تک اُس کی زیارت کرتے تھے[1]۔ حضرت معاذ بن عمرو بن الجموح کے متعلق روایت ہے کہ لڑتے لڑتے ہاتھ کٹ گیا مگر پروانہ کی اور برابر لڑتے رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کمانڈ[2] کوئی فوج کیسی ہی منظم، طاقتور اور بہادر ہو، لیکن اگر اُس کی قیادت (Command) اعلیٰ نہیں ہے تو اُس سے خاطر خواہ نتائج کی توقع نہیں ہو سکتی، غزوۂ بدر میں اسلامی فوج کی عظیم الشان فتح کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اس کی قیادت براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی اور ایسے اعلیٰ پیمانہ پر کی تھی کہ دنیا کے بڑے بڑے قائدین، جنگ عش عش کر اٹھے، یوں تو یہ سب حضرات آپ کے دامانِ تعلیم و تربیت کے پروردہ تھے ہی۔ جنگ کے موقع پر آپ نے اُن کی جو قیادت فرمائی اُس کے نمایاں خدوخال یہ چیزیں ہیں:

(۱) جنگ کے لئے بہترین جگہ کا انتخاب فرمایا جہاں سے دشمن پر پانی کی سپلائی کو روکا جا سکتا تھا۔

(۲) لشکر قریش میں روزانہ کتنے اونٹ ذبح ہوتے ہیں؟ اس سے آپ نے لشکر کی تعداد کا صحیح اندازہ لگا لیا۔

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ بدر

[2] اس موضوع پر میجر محمد اکبر کی کتاب "حدیث دفاع" پڑھنی چاہئے جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وقت کے بہترین ماہرِ فنِ حرب تھے۔

(۳) لشکر میں کون کون سے قریش کے جیالے ہیں اور اُن کے پاس کیا کیا سازوسامان ہے ؟ ایک جاسوس کے ذریعہ آپ نے اس کا پتہ چلالیا۔

(۴) اپنی بصیرتِ خداداد سے میدان جنگ میں گھوم پھر کر آپ نے یہ بھی بتادیا کہ سرداران قریش میں سے کون کہاں مارا جائے گا (صحیح بخاری وسیرت ابن ہشام وغیرہ)

(۵) مزید برآں آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ لشکر قریش میں کون کیسا ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کے متعین طور پر نام لیکر آپ نے ہدایت فرمائی کہ انھیں قتل نہ کیا جائے کیونکہ وہ بادل نخواستہ لشکر کے ساتھ آگئے ہیں۔

(۶) جب جنگ شروع ہونے کا وقت آیا تو آپ نے ایک نہایت پر زور اور ولولہ انگیز خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس سے لشکر اسلامی کا حوصلہ بڑھا اور ان میں غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا۔

(۷) اس کے بعد خود گھوم پھر کر صفوں کی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ترتیب کی اور پورے لشکر کو میمنہ، میسرہ وغیرہ حصوں میں تقسیم کیا، جنگ کا نعرہ "احد احد" متعین فرمایا۔ منازلت کے لئے جوڑ مقرر فرمائے، زخمیوں کے لئے طبی امداد کا انتظام کیا، مدینہ سے ربط قائم رکھنے کا بندوبست اور لشکر کے لئے سامان رسد کے پہونچنے کا اہتمام کیا گیا (التراتیب الاداریہ للکتانی) علاوہ ازیں آپ نے لشکر کو مندرجۂ ذیل ہدایات دیں :

(الف) جب تک دشمن جنگ میں پہل نہ کرے تم نہ کرنا۔

(ب) دشمن فاصلہ پر ہو تو خواہ مخواہ تیر اندازی کر کے ترکش خالی نہ کرنا۔

(ج) دشمن پیشقدمی کرے تو فاصلہ کی مناسبت سے حسب ضرورت ومصلحت پہلے تیر، پھر نیزے اور اس کے بعد تلواروں سے کام لینا۔

کسی ماہر جنگ سے پوچھئے کہ فنی طور پر ان ہدایات کی کیا اہمیت ہے۔

جب جنگ شروع ہو گئی تو آپ اپنی قیام گاہ عریشہ سے اُس کی برابر نگرانی فرماتے رہے اور اگر کوئی ضرورت ہوئی تو فوراً آپ میدان میں پہونچ گئے اور صورتِ حال کی اصلاح کر دی،

چنانچہ منازلت کے بعد صفوں میں ذرا بے ترتیبی پیدا ہو گئی تھی، حضورؐ تشریف لائے اور صفیں درست کر دیں۔

مستشرقین کا اعتراف

ہم نے اوپر جو اسباب فتح بیان کئے ہیں، مستشرقین بھی انھیں تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ پروفیسر مونٹگمری لکھتے ہیں:

"متعدد اسباب اور عوامل ہیں جو مل جل کر اس شاندار فتح کا باعث ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ قریش میں آپس میں اتحاد نہیں تھا۔ جو لوگ لشکر سے الگ ہو گئے ان کی وجہ سے لشکر کی تعداد نو سو پچاس سے گھٹ کر چھ سو یا سات سو رہ گئی، اور ان میں بھی بہت سے لوگ دل سے ابوجہل کے طرفدار اور حامی نہیں تھے، پھر یہ لوگ اپنے سے متعلق حد سے زیادہ خود اعتمادی بھی رکھتے تھے، ایسے دشمن کے مقابلہ میں مسلمانوں کی اسپرٹ دیکھنی چاہیئے، ان لوگوں کے عقیدۂ آخرت نے جنگ میں ان کو بہت زیادہ بہادر اور حوصلہ مند بنا دیا تھا، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اعتماد نے ان میں خود اعتمادی کی روح بھر دی تھی، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جنگی قیادت بھی اعلیٰ درجہ کی تھی جس سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہونچا، یہ وہ خاص اسباب ہیں جو مسلمانوں کی فتح کا باعث نظر آتے ہیں[1]۔"

اسباب کونیہ

انسان خلوصِ نیت سے اور فطرت کے توانین طبیعی کے مطابق حسنِ عمل اور جد و جہد میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا تو قدرت بھی اس کی تائید اور مدد کرتی ہے۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ جس روز صبح کے وقت جنگ ہونے والی ہے اس سے پہلی شب میں اگر سپاہ کو نیند نہ آئے تو اُس کی طبیعت کسلمند ہو جاتی ہے اور اُس کا اثر جنگ

---

[1] Mohammad at Medinah P: 13.

کی حالت میں کچھ نہ کچھ محسوس ہوتا ہے۔ یہاں اللہ کا فضل وکرم یہ ہوا کہ اس شب میں صحابہ کو نیند آگئی، صبح اٹھے تو لڑنے کے لئے تازہ دم تھے، دوسرا لطفِ خداوندی یہ ہوا کہ اسلامی لشکر جس میدان میں خیمہ فگن ہوا تھا اُس کی زمین پولی یعنی نرم تھی، فوج کے لئے چلنے میں دشواری تھی، فضل الٰہی یہ ہوا کہ بارش ہوگئی اور وہ بھی اتنی کہ زمین سنگلاخ ہوگئی، اس قدر زیادہ نہیں کہ کیچڑ ہوجائے اور چلنا دشوار ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان دونوں انعامات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ۝ (انفال)

وہ وقت یاد کرو کہ اللہ نے تم پر نیند تم کو سکون دینے کے لئے طاری کردی اور تم پر آسمان سے بارش نازل کی تاکہ وہ تم کو پاک صاف کردے، وسوسۂ شیطان سے تم کو دور کردے اور تمھارے دلوں کو مضبوط اور تمھارے قدموں کو غیر متزلزل بنادے۔

تقدیر کا غلط اور تباہ کن تصور

بد قسمتی سے مسلمانوں میں تقدیر کا جو غلط اور تباہ کن تصور عام طور پر پایا جاتا ہے۔ جس نے ان کی قوت عمل کو شل اور مفلوج کردیا ہے اور جو ہمارے نزدیک نتیجہ ہے خلقِ افعالِ عباد کے بارہ میں اشاعرہ اور معتزلہ میں اختلاف کا اُس کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر ہم اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ اسباب تین قسم کے ہوتے ہیں: (۱) اسباب ظاہرہ، ان کا تعلق انسان کے اپنے عقیدہ اور عمل سے ہے، (۲) اسباب کونیہ، ان کا تعلق تکوینیات سے ہے اور اسباب معنویہ: ان کا تعلق خدا کی مشیت اور ارادہ سے ہے، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک طالب علم کو گھر میں بہترین تربیت ملی ہے، کالج میں اُس کی تعلیم اور اُس سے متعلقہ امور کا نہایت اعلیٰ انتظام اور بندوبست ہے، پھر امتحان گاہ میں بھی اس کے لئے سکونِ قلب، یکسوئی اور دماغی راحت وآسائش کا مکمل اور خاطر خواہ انتظام واہتمام ہے لیکن بایںہمہ امتحان میں اُس کی کامیابی اور ناکامیابی کا دار و مدار صرف اس بات پر ہے کہ اس نے امتحان گاہ میں بیٹھکر پرچہ کیسا کیا ہے، اگر اس نے پرچہ اچھا کیا ہے اور وہ کامیاب ہوتا ہے تو یہ اس کے سعی وعمل

کا نتیجہ ہے، لیکن ساتھ ہی خدا کی مدد (اسباب معنویہ) یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طالب علم کو ذہانت دی، حافظہ دیا، صحت عطا فرمائی اور اعلیٰ تعلیم و تربیت کے مواقع مہیا کئے۔ طالب علم کا کمال یہ ہے کہ اُس نے خدا کی ان نعمتوں سے فائدہ اٹھایا اور اپنے عمل اور جد وجہد کے ذریعہ خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔ اب پورا قرآن پڑھ جائیے، آپ دیکھیں گے کہ انسانی عمل اور جد وجہد اور اُس پر ثواب و عقاب سے متعلق اُس کی تعلیمات کا خلاصہ یہی ہے، اس سلسلہ میں کسی قدر تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ غزوۂ بدر سے متعلق آیات میں ایک آیت ہے: "وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ" اکثر واعظین اس آیت کا نہایت غلط اور گمراہ کن مطلب بیان کرتے ہیں، ان کے نزدیک اسباب ظاہرہ کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔

غزوۂ بدر کے نتائج

یہ جنگ دینی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے نہایت اہم تھی۔ صرف تاریخِ اسلام ہی میں نہیں۔ بلکہ تاریخِ عالم میں اگر اس کو نیا موڑ اور ایک عظیم الشان انقلاب کا پیش خیمہ کہا جائے تو اس میں ذرا مبالغہ نہیں ہوگا۔

اولاً دینی حیثیت کو لیجئے! جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں غزوۂ بدر کا مقصد ہرگز اہل مکہ کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا نہیں تھا۔ بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اُن کی شدید مخاصمت کا جواب دینا اور اپنے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی آزادی اور حریت ضمیر کا حق حاصل کرنا تھا۔ لیکن بہرحال چونکہ یہ جنگ ہوئی تھی اسلام کے عنوان اور نام سے اس بنا پر دینی حیثیت سے اس سے حسب ذیل فوائد حاصل ہوئے:

(۱) اس جنگ سے یہ ثابت ہو گیا کہ جو لوگ سچے دل اور کمالِ خلوص و للٰہیت سے اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ بے سر و سامانی کے باوجود کیا کچھ نہیں کر سکتے!

(۲) قبائلی عصبیت عرب عہدِ جاہلیت کی سب سے بڑی گمراہی تھی۔ اس عصبیت کے باعث حق اور باطل، نیک و بد اور سچ اور جھوٹ کے درمیان وہ کوئی فرق اور امتیاز نہیں کر سکتے تھے، غزوۂ بدر نے اس عصبیت پر ضرب کاری لگائی، دنیا نے دیکھا کہ فرزندانِ توحید

اپنے ہی خاندان اور قبیلہ کے لوگوں اور قریبی اعزاء اقارب کے مقابلہ میں کس بے جگری سے لڑے ہیں، جذبۂ توحید سے سرشار ہو کر باپ نے بیٹے کی، بھائی نے بھائی کی، بھتیجے نے چچا کی اور خسر نے داماد کی ذرا پروا نہیں کی اور ایک کلمۂ حق کو سربلند و سرفراز کرنے کے لئے ہر اس چیز کو ٹھکرا دیا جو اس زندگی میں ہر انسان کو عزیز سے عزیز تر ہوتی ہے، مذاہب عالم کی تاریخ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے اور آخری پیغمبر ہیں جنھوں نے شمشیر و سناں کی نوکِ زبان سے لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ کی شہادت پیش کی ہے آپ کا یہی وہ وصفِ خصوصی ہے جس کا اظہار آپ نے انا نبی الملحمۃ کہکر فرمایا ہے، دشمنوں کا برا ہو کہ انھوں نے اس فقرہ کا مطلب یہ نکالا ہے کہ پیغمبر اسلام خود اپنے بقول تلوار کے پیغمبر ہیں اور اس لئے اسلام تلوار سے پھیلا ہے، قالی اللہ المشتکی۔ پروفیسر منٹگمری واٹ لکھتے ہیں:

> "جنگ بدر کا نہایت اہم نتیجہ یہ ہوا کہ پیغمبر اسلام میں خود اپنے متعلق اور ان کے قریبی ساتھیوں میں ان کی پیغمبری کے بارہ میں بہت گہرا یقین پیدا ہو گیا، انھوں نے سالہا سال شدید آلام و مصائب میں بسر کئے تھے اور اس مدت میں اگر کوئی چیز ان کے لئے ڈھارس کی تھی تو صرف ان کا عقیدہ اور ان کا ایمان تھا۔ اس بنا پر اب جنگ میں جو یہ شاندار فتح حاصل ہوئی تو اس سے ان کا عقیدہ اور مضبوط ہو گیا، کیونکہ کفار کو ان کے کئے کی جو یہ سخت سزا ملی ہے قرآن کی مکی آیات میں اس کی پیش گوئی پہلے ہی کر دی گئی تھی۔" (ص ۱۶)

(۲) علاوہ ازیں غزوۂ بدر کا اہم سیاسی نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک اسلام دفاعی پوزیشن (defensive line) میں تھا لیکن اب اس نے اقدامی (Assertive) صورت اختیار کر لی۔ قریش جن کی شجاعت و دلیری، طاقت و قوت اور دولت و ثروت کا لوہا سارا عرب مانتا تھا اب اس کا جادو ٹوٹ گیا تھا۔ دوسرے قبائل اور خود مدینہ کے یہود اور منافقین کا اُس سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ اسلام نے اب یہ طے کر لیا تھا کہ بغض و عداوت

غدر و خیانت اور بغاوت و سرکشی کو اُس کے حیطۂ اقتدار میں کہیں سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ سیاسی حیثیت سے اب اسلام تحریک کے دوسرے دور میں داخل ہو رہا تھا جو اُس کا دور تطہیر وتنقیہ (Purgingant) تھا جس کے بغیر کسی اسٹیٹ یا سوسائٹی میں استحکام (Stability) پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جیسا کہ آگے چل کر آپ پڑھیں گے کہ کعب بن اشرف یہودی کا قتل اور قبائل یہود کے ساتھ جو معاملہ ہوا، یہ سب کچھ اس دور کا طبعی تقاضا تھا، اسلام اب ایک اسٹیٹ تھا اور ہر اسٹیٹ کا فرض ہے کہ وہ اندرونی سالمیت (Internal Security) اور بیرونی سالمیت (External Security) دونوں کا خیال رکھے، جو چیز دنیا کی ہر اسٹیٹ کا قانونی حق ہی نہیں بلکہ فرض ہو اسلام کی ریاست کو اُس سے کیونکر محروم رکھا جاسکتا ہے۔

غلطی کی تصحیح

گذشتہ ماہ جون کے برہان میں صفحہ ۳۳۲/۱۲ پر عربی کے جو دو شعر آئے ہیں، افسوس ہے ان کا ترجمہ غلط ہو گیا، صحیح ترجمہ یہ ہے: "تم لوگ زمانۂ امن میں توحمارِ وحشی بن جاتے ہو، لیکن جنگ ہو تو دشمن کے مقابلہ میں حیض والی عورتیں ہو جاتے ہو"۔

(بشکریۂ مولانا جلیل احسن صاحب ۔ جامعۃ الفلاح، اعظم گڈھ)

گذارش: خریداری برہان یا ندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلہ میں خط وکتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر برہان کی چٹ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر نہ ہو۔ اس وقت بے حد دشواری ہوتی ہے جب ایسے موقعہ پر آپ صرف نام لکھنے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ (مینجر)

عہد نبوی کے غزوات وسرایا

اور

ان کے مآخذ پر ایک نظر

اسلام اور یہود

(۱۲)

سعید احمد اکبرآبادی

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اب جب کہ مدینہ، ماڈرن پالٹیکل سائنس کی اصطلاح اور تعریف کے مطابق، ایک ریاست تھا جس کے صدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو اس کے استحکام کے لئے آپ کو لامحالہ تین کام کرنے پڑتے تھے (۱) داخلی تحفظ کے انتظامات (۲) سرحدوں کا تحفظ (۳) سرحدوں کی توسیع (Tarritorial Expansion)

داخلی تحفظ (Internal Ceconity) کا تقاضا۔ جس کو دنیا کے تمام قوانین وضوابط اور دساتیر و آئین تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ہے کہ جو لوگ ریاست کے وفادار نہیں ہیں، اور اس بنا پر ریاست، یا صدر ریاست، یا دستور و آئین ریاست کے خلاف معاندانہ اور شرانگیز رویہ رکھتے ہیں، ان کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں میں منہمک رہتے ہیں۔ ریاست کو نقصان پہونچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے، یہ سب لوگ غدار (Treason)

اور خیانت (high treason) کے جرم کے مرتکب ہیں۔ اس بنا پر ریاست کو ان سے پاک وصاف ہونا چاہیئے، جرم کی شدت ونوعیت کے اعتبار سے اس کی صورتیں دو ہی ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ ان کو جلا وطن کیا جائے اور دوسرے یہ کہ قرآن کے حکم الفتنۃ اشد من القتل کے مطابق ان کا کام تمام کردیا جائے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کے مختلف قبیلوں اور بعض اشخاص وافراد کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ داخلی تحفظات کے اسی تقاضہ کے ماتحت کیا۔ پھر آپ نے جو غزوات کئے ان کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ دشمن نے خود مدینہ پر چڑھائی کی، آپ نے اس کا دفاع کرکے سرحدی تحفظ کا انتظام کیا، دوسری صورت یہ تھی کہ آپ کو معلوم ہوا کہ دشمن مدینہ پر چڑھائی کا منصوبہ بنا رہا ہے، تو قبل اس کے کہ وہ اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنائے آپ نے خود پیش قدمی کرکے اس کے منصوبہ کو ناکام بنادیا۔ مکہ آپ کا وطن تھا اور قبلۂ اسلام بھی وہیں تھا اس لئے اس کا فتح کرنا بھی ضروری تھا۔ اس طرح کے غزوات توسیع حدود کے ماتحت آتے ہیں۔ اب ہم علی الترتیب ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ کلام کریں گے۔

مدینہ کے داخلی تحفظ کو جن لوگوں سے خطرہ تھا وہ دو طبقوں پر مشتمل تھے ایک منافقین اور دوسرے یہود، منافقین کے ساتھ حضورؐ نے جو برتاؤ کیا اس کو اور اس کے وجوہ واسباب کو ہم پہلے بیان کرچکے ہیں، اب صرف یہود کا معاملہ رہ جاتا ہے، یہ چونکہ تاریخ اسلام کا ایک نہایت اہم باب ہے اس بنا پر داخلی تحفظات کے سلسلہ میں آپ نے یہود کے خلاف جو اقدامات کئے ان کو بیان کرنے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود کے تعلق کا تاریخی پس منظر بیان کردینا ضروری ہے۔

قرآن مجید میں یہود کا تذکرہ

یہود مدینہ کون لوگ تھے، کس نسل سے تعلق رکھتے تھے، حوالی مدینہ میں کہاں سے آکر آباد ہوئے تھے، یہ کتنے قبیلوں پر مشتمل تھے، ان کے ذرائع معاش اور پیشے کیا کیا تھے، مدینہ میں ان کے اقتدار کا کیا عالم تھا، قبیلۂ اوس وخزرج

کے ساتھ ان کے تعلقات کس قسم کے تھے؟ ہم ان سب چیزوں کا مختصر تذکرہ ہجرت کے باب میں کر آئے ہیں، اب یہ سنئے کہ قرآن مجید کا رویہ ان کے ساتھ کیا رہا ہے۔

قرآن مجید میں یہود کا ذکر دو قسم کی آیات میں ہے (الف) ایک وہ آیات جن میں خاص طور پر یہود کو خطاب کیا گیا یا ان کے اعمال و افعال اور افکار و مزعومات کا تذکرہ فرمایا گیا ہے (ب) اور دوسری قسم ان آیات کی ہے جن میں عیسائیوں کے ساتھ شریک کر کے اہل کتاب کے مشترک لفظ سے ان کو خطاب کیا گیا یا ان کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان سب آیات میں جو مضامین بیان کئے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) یہود کی استمالت (Persicstion) اور اسلام کے قبول کر لینے پر ان کی تحریص و ترغیب۔

(۲) یہود جن اعتقادی اور عملی گمراہیوں میں مبتلا تھے ان کی نشاندہی اور ان پر تنبیہ۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان لوگوں نے جو سخت معاندانہ اور عداوت کی روش اختیار کی تھی اس پر ان کو تنبیہ اور مسلمانوں کو ان سے ہوشیار و خبردار رہنے کی تاکید۔

آیات نمبر اول میں قرآن مجید میں جس فراخدلی اور وسعتِ قلب سے حضرت موسیٰ اور ان کی کتاب توراۃ اور دوسرے انبیائے بنی اسرائیل کی مدح اور تعریف و توصیف کی گئی ہے وہ قرآن کا وصف امتیازی و خصوصی ہے، دنیا میں کوئی الہامی یا آسمانی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں کسی دوسرے مذہب کے پیغمبروں اور ان کی کتابوں کا ذکر اس درجہ عظمت، فراخدلی اور فیاضی کے ساتھ اور اس کثرت اور تکرار سے کیا گیا ہو[1]، یہ سب کچھ درحقیقت بنیاد ہے

---

[1] یہود سے متعلق قرآن مجید میں آیات اس کثرت سے ہیں کہ انھیں کلاً یا جزءً نقل کرنے کی گنجائش اس مقالہ میں کہاں ہوسکتی ہے، جو اصحاب ان آیات کا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اُس وحدتِ دین کی جس کا داعی قرآن مجید ہے اور اسی وجہ سے جو لوگ دین میں تفریق کرتے اور اس بنا پر پیغمبر پیغمبر میں فرق و امتیاز کرتے ہیں قرآن ان کی سخت مذمت کرتا ہے، اور وحدت دین کا مطلب یہ ہے کہ جب دین ایک ہی ہے اور باری باری سے جو پیغمبر اس کے داعی اور مبلغ ہوکر آرہے ہیں تو اب دین کے ساتھ وفاداری کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ جو پیغمبر جس کے زمانہ میں آئے وہ اگرچہ ایمان تمام پیش رو پیغمبروں پر لائے گا لیکن اطاعت اور فرماں برداری اپنے عہد کے پیغمبر کی اسی طرح کرے گا جس طرح حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے عہد کے لوگ (جو اُن پر ایمان لے آئے تھے) علی الترتیب اپنے اپنے عہد میں کرتے تھے، غور کرنا چاہیئے کہ قرآن کا یہ تصور وحدتِ دین کس درجہ فطری (Natural) معقول (Reasonable) اور منطقی (Logical) ہے جس سے کسی طبعِ سلیم کو انکار نہیں ہو سکتا، قرآن کی یہی وہ دعوت ہے جس کو اُس نے یہود اور نصاریٰ کے سامنے نہایت موثر و دلنشین پیرایۂ بیان میں بار بار پیش کیا ہے، یہاں تک کہ قرآن نے صاف لفظوں میں کہا :

قُلْ يَآ أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا	اے پیغمبر کہد یجئے کہ اے اہل کتاب تم اس چیز کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یکجائی مطالعہ مع اردو ترجمہ کے کرنا چاہیں انھیں حسب ذیل کتابوں سے مدد لینی چاہیئے :

(۱) تبویب القرآن بضبط مضامین الفرقان از مولانا وحید الزماں نواب وقار نواز جنگ، حیدر آباد

(۲) مقدمۂ اردو ترجمۂ قرآن از مولانا نذیر احمد دہلوی

(۳) ترجمان القرآن سورۂ فاتحہ ۔ از مولانا ابوالکلام آزاد

وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُوْنِ اللّٰہِ ۔ (آل عمران) کی عبادت نہیں کریں گے، اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کریں گے اور اللہ کے سوا ہم میں سے کوئی کسی کو اپنا آقا تسلیم نہیں کرے گا۔

پھر قرآن کے وحدت دین کے اسی تصور کا ایک عملی نمونہ دکھانے کے لئے یہاں تک کیا گیا کہ پہلے (یا دوسری مرتبہ) قبلہ بیت المقدس کو قرار دیا گیا اور اس کے بعد اسے بدل کر کعبہ کو بنا دیا گیا۔ قاضی بیضاوی (سیقول السفہاء کی تفسیر کے ماتحت) تو یہ لکھتے ہیں کہ بیت المقدس کو جو قبلہ بنایا گیا تھا وہ یہود کی تالیفِ قلب کے لئے بنایا گیا تھا لیکن ہم یہ نہیں کہتے، ہمارے نزدیک تحویل قبلہ کا مقصد یہ جتانا تھا کہ قبلہ کونسا مقام ہو؟ یہ صرف ایک فروعی چیز ہے جس کا تعلق ان رسوم شریعت سے ہے جن کی تعلیم ہر پیغمبر جداگانہ طور پر دیتا ہے، یہ دین کا صرف ایک مظہر ہے، عین دین نہیں ہے، اصل اور عین دین تو اللہ پر ایمان، اُس کی عبادت اور اس کے احکام کی پیروی ہے۔ جیسا کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ الیٰ آخر الآیۃ میں فرمایا گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ تحویلِ قبلہ تو وحدتِ دین کا ایک عملی ثبوت ہے، نہ کہ اس کا انکار۔ پھر یہود اُس پر کیوں معترض ہوتے ہیں۔

اچھا! قرآن وحدت دین کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ بالکل بجا اور درست! لیکن یہود اور نصاریٰ کہہ سکتے تھے کہ اس تصور کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے واجب الاتباع اُس وقت ہوں گے جب کہ پہلے یہ تو ثابت ہو کہ آپ پیغمبر برحق اور مرسل من اللہ ہیں، اسی دغدغہ کو دور کرنے کی غرض سے قرآن نے ان کو یاد دلایا کہ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کے مبعوث ہونے کی خبر توراۃ اور انجیل دونوں میں دی گئی ہے اور یہود تو خاص طور سے اس پیغمبر موعود کا انتظار بڑی شدت سے کر رہے تھے، کیونکہ اُن کے علم

کے مطابق اس پیغمبر کا زمانۂ بعثت آچکا تھا اور اس بنا پر قبیلۂ اوس وخزرج کے لوگوں سے بہ طور فخر کہتے تھے کہ "اب وہ پیغمبر آنے والا ہے اور ہم اس پر ایمان لاکر تم لوگوں کو مغلوب کرلیں گے۔" قرآن کہتا ہے کہ "لو! جس پیغمبر کا تم انتظار کر رہے تھے وہ آگیا، اب اس پر ایمان کیوں نہیں لاتے، ہاں لیں! بات اتنی ہے کہ وہ پیغمبر تم میں پیدا نہیں ہوا۔ تو یاد رکھو کہ پیغمبری کسی خاص خاندان یا نسل کی اجارہ داری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی حکمت جہاں چاہتی ہے پیغمبر پیدا کر دیتی ہے، یہ سب کچھ یاد دلانے کے ساتھ قرآن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ثابت اور موکد کرنے کے لئے دلائل وبراہین قاطعہ بھی پیش کئے جس کے بعد اس میں کوئی شک باقی ہی نہیں رہتا کہ آپ وہی پیغمبر موعود ہیں جن کی بشارت توراۃ اور انجیل میں مذکور تھی"، اب اس کے بعد یہود کے لئے مجالِ انکار کیا اور اور کیونکر ہوسکتی تھی، اس پورے سلسلہ کی جو آیات قرآن مجید میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں ان سب کا مطالعہ یکجائی طور پر کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ ملاطفت، افہام وتفہیم اور ارشاد و ہدایت کا وہ کونسا دقیقہ ہے جسے قرآن مجید نے یہود کے خطاب میں فروگذاشت کر دیا ہے۔

الطاف وانعامات الٰہی کا ذکر

پھر اس سلسلہ میں قرآن مجید نے یہود کو یہ بھی یاد دلایا کہ فرعون نے ان کو کس طرح ذلیل وخوار اور مظلوم ومقہور بنا رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ذریعہ ان کو اس سے نجات دلائی، اور جب جنگل میں کچھ کھانے کو نہیں ملتا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان پر منّ وسلویٰ نازل کئے، دوبارہ ان کو حکومت وسلطنت اور سربلندی وسرفرازی عطا فرمائی، ان کی نسل میں بڑے بڑے پیغمبر پیدا کئے، ان کو دولت وثروت سے نوازا اور انھیں خوش حالی بخشی، لیکن یہ لوگ اپنی سرکشی، بغاوت اور احکام الٰہی سے سرتابی سے باز نہیں آئے اور انبیائے کرام کے قتل تک کے جرائم کا ارتکاب کیا تو پھر پانسہ پلٹ گیا اور رومیوں نے ان پر مسلط ہو کر انھیں کہیں کا نہیں رکھا۔

آیات نمبر ۲ — یہود کے عہد قدیم کے یہ وہ تاریخی حقائق و واقعات ہیں جن کو قرآن مجید نے ان کی عبرت و بصیرت اور موعظت پذیری کی غرض سے بیان کیا ہے، خاص یہود مدینہ کے اعمال و افعال، اخلاق و عادات اور دسائس و مکائد کی پردہ دری میں بھی اس نے کوئی کسر اٹھا کے نہ رکھی، اس نے یہ بتایا کہ یہ لوگ گناہ اور حد سے تجاوز کی طرف پیشقدمی کرنے میں بڑی جلدی کرتے ہیں، سودی لین دین کے رسیا اور ناجائز طریقہ پر لوگوں کا مال ہڑپ کر لینے پر بڑے حریص ہیں، مسلمانوں کو جلی کٹی باتیں سنانے میں ان کو مزہ ملتا ہے، وغیرہ وغیرہ،

آیات نمبر ۳ — ہزار افہام و تفہیم، لطف و مدارات اور تنبیہ کے بعد بھی جب یہود ٹس سے مس نہ ہوئے اور اسلام قبول کرنا تو کجا، ایک اسلامی ریاست کے شہری کی حیثیت سے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ایک ادنیٰ درجہ کی رواداری برتنی بھی گوارا نہیں کی تو آخرکار قرآن کو اعلان کرنا پڑا کہ یوں کہنے کو تو عیسائی اور یہود دونوں ہی اہل کتاب ہیں، لیکن درحقیقت عملاً دونوں میں بڑا فرق ہے، چنانچہ اس نے کہا:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (المائدہ)

اے پیغمبر جو لوگ ایمان لے آئے ہیں ان کے سب لوگوں سے زیادہ سخت دشمن آپ یہود اور مشرکین کو حتمی طور پر پائیں گے، اور ان کے برعکس آپ ایمان لانے والوں سے باعتبار دوستی کے سب سے زیادہ قریب بغیر کسی شک کے اُن لوگوں کو پائیں گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان نصاریٰ میں علماء اور زاہد و عابد ہیں اور یہ گھمنڈ نہیں کرتے، اور جب یہ اس کلام کو سنتے

ہیں جو ہمارے رسول (محمد) پر اتارا گیا ہے تو
آپ ان کی آنکھوں کو اشکبار دیکھیں گے، کیونکہ
انھوں نے حق کو پہچان لیا ہے، (چنانچہ) وہ
کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے
ہیں، اس لئے تصدیق کرنے والوں کے ساتھ آپ
ہمارا نام بھی لکھ دیجئے۔

یہود کے ساتھ حسنِ خلق اور لطف و مدارات کا معاملہ | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مردم شناسی اور نفسیات انسانی کی پہچان میں اعلیٰ کمال رکھتے تھے، اس لئے یہود کی رگ رگ اور نس نس سے باخبر تھے اور ان کی کوئی جلی اور خفی حرکت ایسی نہیں تھی جو آپ پر پوشیدہ ہو، لیکن اسلام نے اپنے اور پرائے، دوست اور دشمن، ہر ایک کے ساتھ عدل و انصاف اور حسنِ خلق و مدارات کا معاملہ کرنے کا جو حکم دیا اور اُس کی تاکید کی ہے[1]، اس سے یہود بھی

---

[1] عدل و انصاف کے بارہ میں اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے: قرآن میں فرمایا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ، وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا، اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ۔ (المائدہ)

اے ایمان والو، تم اللہ کے گواہ ہو کر عدل و انصاف کے علمبردار اور اُس کے محافظ بن جاؤ، اور ہاں دیکھو تمھارے ساتھ کسی قوم کی عداوت تم کو انصاف کے راستہ سے برگشتہ نہ کرنے پائے، تم ہر حالت میں انصاف کرو، یہ شیوۂ عدل ہی تقویٰ و طہارت سے قریب تر ہے۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن و طنز کرنے والے کہاں ہیں! کان کھول کر سن لیں، پھر ارشاد ہوا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۷ پر)

بہرہ مند اور فیض یاب تھے، بلکہ جیسا کہ گذر چکا ہے آپ نے ان لوگوں کے ساتھ توخصوصی معاملہ یہ کیا کہ ان کے مختلف قبائل کے ساتھ معاہدہ کیا اور اس میں یہود کو اپنے دین پر قائم رہنے کی آزادی عطا فرمائی اور ان کی جانوں اور مال و متاع کو مسلمانوں کی جانوں اور ان کے اموال کی طرح محفوظ و مامون قرار دیا، اس سے قطع نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ عدل و انصاف اور حسن خلق کا جو معاملہ کیا ہے اس کی چند مثالیں لیجئے، ورنہ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں اس قسم کے واقعات کثرت سے منقول ہیں:

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ۚ وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝

(النساء) ع ۲۰

ایمان والو! انصاف کے علمبردار اور محافظ اور اللہ کے لئے گواہ بنو، اگرچہ اس میں تمہارا اپنا، تمہارے والدین اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو، ان لوگوں میں کوئی مالدار ہے یا محتاج (تم اس کی پروانہ کرو) کیونکہ اللہ ان کی تم سے بہتر طریقہ پر خبر گیری کرنے والا ہے تو ہاں دیکھو (انصاف کے معاملہ میں) من مانی نہ کرو جس کے باعث تم عدل کے راستہ سے منحرف ہو جاؤ، اگر تم اس میں ہچکچاؤ گے یا حق سے اعراض کرو گے تو سمجھ لو کہ اللہ بے شبہ تمہارے کرتوتوں سے باخبر ہے۔

رہا حسن خلق! تو اسلام کا دوسرا نام ہی حسن خلق ہے، چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵ پر)

عدل وانصاف

حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ طعمۃ بن ابیرق نے قتادہ بن النعمان کی ایک زرہ چوری کرلی اور اسے گھر لے جاکر ایک یہودی کے پاس پوشیدہ رکھ دیا۔ اب زرہ کی تلاش ہوئی اور وہ یہودی کے گھر دستیاب ہوگئی تو لوگوں نے یہودی کو ہی ملزم ٹھہرالیا۔ ہرچند اس نے حقیقت واقعہ بیان کی، مگر کسی نے اس کا اعتبار نہیں کیا، آخر معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا، اب یہودی کے خلاف متعدد شہادتوں کی بنیاد پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہودی کے خلاف فیصلہ سنانے والے تھے ہی کہ اچانک آیت ذیل نازل ہوئی:

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا (النساء) [1]

ہم نے سچائی کے ساتھ کتاب آپ پر بے شبہ اس لئے نازل کی ہے کہ اللہ نے آپ کو جو کچھ دکھایا ہے آپ اس کے مطابق لوگوں کے معاملات

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴)

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاق میں اس لئے مبعوث کیا گیا ہوں کہ اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں، اس سلسلہ میں اسلام کا رجحان طبعی (Natural trend) کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس آیت سے ہوگا:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ

اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں ہیں، آپ اپنی طرف سے مدافعت ایک ایسے طریقہ سے کیجئے جو بہتر ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہو کہ جو تمہارا دشمن جانی ہے وہ جگری دوست بن جائے۔

[1] لیکن محدثین کے نزدیک اس روایت کی اسناد ضعیف ہیں۔ تفسیر ابن جوزی ج ۲ ص ۱۹۰

کا فیصلہ کریں اور آپ دغابازوں کے طرفدار نہ

ہوں۔

ابن ابی حدرد الاسلمی صحابی تھے، انھوں نے ایک یہودی سے چار درہم قرض لئے تھے، لیکن مقررہ وقت پرادا نہ کرسکے، یہودی نے حضورؐ سے شکایت کی، آپ نے حضرت ابن ابی حدرد سے فرمایا: "یہودی کا جو واجبی مطالبہ ہے اسے پورا کرو" ابن ابی حدرد نے عرض کیا: "حضورؐ! خدا کی قسم! یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے" حضورؐ نے دوبارہ پھر وہی فرمایا تو ابن حدرد نے بھی جواب میں اسی پہلی بات کا اعادہ کیا اور مزید کہا: "معلوم ہوا ہے کہ آپ ہم لوگوں کو خیبر کی مہم پر روانہ کرنے والے ہیں، اگر وہاں مال غنیمت میں مجھے کچھ مل گیا تو میں اس میں سے یہودی کا قرض ادا کردوں گا" لیکن یہ سن کر حضور نے پھر یہی فرمایا: "تم یہودی کا حق ادا کرو" حضور کی عادت تھی کہ ایک بات کو تین مرتبہ کہنے کے بعد پھر اس کی تکرار نہیں کرتے تھے، ابن ابی حدرد سمجھ گئے کہ اس سے مفر نہیں ہے، اس لئے سیدھے بازار گئے، . . . . . .

. . . . ، وہاں اپنی چادر جسے بہ طور تہبند لپیٹ رکھا تھا اسے کھول کر یہودی کے ہاتھ چار درہم میں فروخت کیا اور سر پر جو پگڑی بندھی تھی اس کو تہبند کی جگہ استعمال کیا۔[1]

ایک اور واقعہ سنئے جس کا تعلق خود حضور کی ذات سے ہے:

یہود سے لین دین کا معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی رکھتے تھے، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے اپنی ایک زرہ ایک یہودی کے پاس گروی رکھکر اپنے متعلقین کے لئے اُس سے کچھ غلہ خریدا[2]۔ زید بن سعنہ جو بعد میں مسلمان ہوگئے تھے، جس زمانہ میں

---

[1] مسند امام احمد ساعاتی ج ۱۹ ص ۹۳

[2] کتاب البیوع باب شراء النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالنسیہ

یہودی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا تھا۔ ایک روز وہ اپنا قرض مانگنے آئے تو حضورؐ کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت گستاخی اور بے ادبی کے الفاظ استعمال کئے۔ حضرت عمرؓ اس موقع پر موجود تھے، یہ دیکھکر غصہ سے بیتاب ہوگئے اور سخت زجر و توبیخ کی، رحمتِ عالم یہ دیکھکر مسکرائے اور فرمایا: عمرؓ! مجکو تم سے کچھ اور امید تھی، تم کو زید بن سعنہ سے کہنا چاہیئے تھا کہ نرمی سے کلام کرے اور مجھ سے کہنا چاہیئے تھا کہ اس کا قرض ادا کروں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ سے فرمایا: اس شخص کا قرض میری طرف سے ادا کرکے بیس صاع کھجور کے اسے اور زیادہ دیدو۔[1]

یہودیوں کے باہمی نزاعات کا فیصلہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ کی اس صفتِ عدل و انصاف کا اعتراف یہود کو بھی تھا اور اس درجہ سخت دشمنی اور مخالفت کے باوجود یہ لوگ اپنے باہمی نزاعات وخصومات کا فیصلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی کراتے تھے، چنانچہ بنو نضیر اور بنو قریظہ میں یہ جھگڑا مدت سے چلا آرہا تھا کہ بنو نضیر اپنے مقتول کی دیت پوری وصول کرتے تھے اور بنو قریظہ نصف! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان دونوں نے اپنا معاملہ پیش کیا تو آپ نے دونوں میں برابر کی دیت کا فیصلہ کیا اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی:

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ فَاِنْ جَآؤُكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

حکام یہود جھوٹ باتوں پر کان دھرنے والے اور حرام کمائی (رشوت) کھانے والے ہیں، اس لئے اگر اے محمدؐ یہود آپ کے پاس (اپنا کوئی معاملہ لیکر) آئیں تو آپ کو اختیار ہے کہ ان کے درمیان محاکمہ کریں یا انھیں

---

[1] بحوالہ سیرت النبی مولانا شبلی حصہ اول مجلد دوم ص ۳۵۶

الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (المائدہ) [1]

نظرانداز کر دیں، آپ نے اگر انھیں نظر انداز کر بھی دیا تو یہ ہرگز آپ کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے، البتہ ہاں اگر آپ اُن کا جھگڑا چکانا چاہیں تو پھر عدل اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کیجئے، اللہ بے شبہ عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اسی طرح ایک محاکمہ آپ نے زنا کے ایک معاملہ میں کیا تھا، سورۃ المائدہ کی ہی دوسری آیتوں میں اس کا تذکرہ ہے، ہر شئی کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی ضد کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دے، حسن نظارہ سوز کا کمال یہ ہے کہ ایک زاہد خشک بھی اسے دیکھے تو اُس کے عشوہ کا اسیر ہو جائے، ایک نغمہ کی غایت سحر کاری یہ ہے کہ پرندے بھی اسے سن کر سکتہ میں آجائیں، ابرکرم کی فیض بخشیوں کی انتہا یہ ہے کہ بنجر اور بے آب وگیاہ زمینیں چمنستانوں میں تبدیل ہو جائیں، نور وحرارت کی عطا گستری کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ ظلمت کدے بقعۂ نور اور تیرہ وتار ویرانے روشن آبادیاں بن جائیں، پس اسی طرح ایک انسان کی عظمتِ اخلاقی کا منتہا یہ ہے کہ اس کا بڑے سے بڑا سرکش دشمن بے ساختہ اس کے عملی اعتراف واقرار پر مجبور ہو جائے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا، مکہ میں تھے تو ابوجہل، عتبہ اور شیبہ تک نے آپ کے امین صادق ہونے کی برملا شہادت دی اور اب مدینہ میں یہود نے ہزار دشمنیوں کے باوجود آپ کو اپنے معاملات میں حکم قرار دے کر آپ کی صفتِ عدل وانصاف پر مہر تصدیق ثبت کی، تاریخ انسانی تہذیب وتمدن کا ایک نہایت عجیب وغریب واقعہ تھا جسے قرآن مجید نے بلاغت کے عام اصول کے مطابق تعجب کے پیرایۂ اظہار میں بیان کیا ہے،

---

[1] تفسیر ابن جوزی ج ۲ ص ۳۶۰ ودیگر تفاسیر

ارشاد ہوتا ہے :

وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ، ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذَالِكَ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ۔

(المائدہ)

اور اے محمد یہ یہود اپنے معاملات میں آپ کو حکم کس طرح بناتے ہیں ۔ درآنحالیکہ ان کے پاس توراۃ ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہے پھر اس کے بعد یہ لوگ اس سے منحرف ہو جاتے ہیں اور یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں ۔

کمال دلجوئی عدل و انصاف کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہود کی دلجوئی بھی فرماتے تھے، چنانچہ یہود کے معاملات کا فیصلہ خود ان کی کتاب توراۃ کی روشنی میں کرتے تھے، آپ مدینہ میں پہونچے اور یہود کو دیکھا کہ صوم عاشورا (محرم کی دسویں تاریخ کا روزہ) رکھتے ہیں تو آپ نے بھی اسے پسند فرمایا اور روزہ رکھا ۔ ایک مرتبہ ایک یہودی نے حضرت موسیٰ کی فضیلت اس طرح بیان کی کہ گویا وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل ہیں۔ ایک صحابی کو اس پر طیش آگیا اور انھوں نے یہودی کے طمانچہ رسید کیا، اس شخص نے حضورؐ سے شکایت کی تو آپ نے فرمایا: "لوگو! مجکو اور پیغمبروں پر ایسی فضیلت مت دو جس سے ان کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہو"، پھر خاص حضرت موسیٰ کی نسبت ارشاد ہوا: "حشر میں سب بیہوش ہو جائیں گے، اس کے بعد سب سے پہلے مجھے ہوش آئے گا تو دیکھوں گا کہ موسیٰ عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں[1]"،

احترام یہود اسلام دشمنی میں مشرکین قریش سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی تھے، تاہم اہل کتاب تھے، اس بنا پر آپ ان کے ساتھ رعایت واحترام کا خاص معاملہ کرتے تھے، ارشاد نبوی ہے کہ کسی مسلمان کا جنازہ گذرے تو کھڑے ہو جاؤ، سرور عالم کا یہی معاملہ یہودیوں کے جنازہ کے ساتھ تھا، چنانچہ ایک مرتبہ آپ چند صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ اتنے میں

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ اعراف

ایک جنازہ گذرا تو آپ حسب معمول کھڑے ہو گئے۔ صحابہ نے عرض کیا: "حضور! یہ تو یہودی کا جنازہ تھا!" آپ نے جواب دیا: "کیا اس میں جان نہیں تھی؟" آپ کے اتباع میں صحابہ کا بھی معمول یہی تھا کہ یہودی کا جنازہ گذرتا تھا تو کھڑے ہو جاتے تھے[1]۔

چشم پوشی اور درگذر یہودی کسی موقع پر بھی خباثتِ نفس سے باز نہیں آتے تھے۔ لیکن آپ ہمیشہ خوش خلقی اور عفو و درگذر کا معاملہ کرتے تھے، ایک مرتبہ یہودیوں کا ایک گروہ خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور السلام علیکم کے بجائے السام علیکم کہا جس کے معنی ہیں "تم پر ہلاکت ہو" حضرت عائشہ اس وقت موجود تھیں، یہ سن کر غصہ سے بیقرار ہو گئیں، اور تڑاق سے جواب میں بولیں: "بدبختو! تم پر خدا کی لعنت اور موت" رحمت عالم نے یہ سنا تو فرمایا: عائشہ! "ذرا صبر کرو!" حضرت عائشہ نے جواب دیا: "حضور! آپ نے سنا بھی، ان لوگوں نے کیا کہا!" آپ نے فرمایا: "ہاں! میں نے سنا اور اس کے جواب میں "وعلیکم" کہہ دیا، بس یہ کافی ہے اور اللہ تعالیٰ ہر معاملہ میں نرمی کو پسند کرتا ہے[2]۔"

یہود سے سماجی تعلقات یہود اور مسلمانوں میں سماجی تعلقات بھی تھے، اوس اور خزرج کے ساتھ تو ازدواجی تعلقات اور رشتہ داریاں بھی تھیں، اسلام مشرکین تک کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے، پھر یہود اس سے کس طرح محروم ہو سکتے تھے، یہودی عورتیں بے تکلف کاشانۂ نبوت میں آتی جاتی تھیں، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ حضرت عائشہ کو کوئی شکایت ہے اور ایک یہودی عورت پاس بیٹھی جھاڑ پھونک کر رہی ہے۔ صدیق اکبر نے اس عورت سے فرمایا: تم کتاب اللہ سے جھاڑ پھونک کرو[3]۔ اسلام میں ہمسایہ کے جو

---

[1] صحیح بخاری باب من قام لجنازۃ یہودی

[2] صحیح بخاری باب طیب الکلام

[3] موطأ امام مالک و عمدۃ القاری ج ۲۱ ص ۲۶۲

حقوق میں ان کا دروازہ یہود کے لئے بھی کھلا ہوا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا ایک لڑکے نے بکری ذبح کی ہے اور اس کا گوشت بنا رہا ہے، حضرت عبداللہ بن عمر نے تاکید کی کہ اس گوشت کا ایک حصہ گھر کے پڑوسی یہودی کے ہاں بھی بھیجا جائے۔ کسی نے کہا: "حضرت! وہ تو یہودی ہے" آپ نے فرمایا: یہودی ہے تو کیا ہوا! پڑوسی تو ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ نے پڑوسی کے حقوق اتنے اور اس تاکید سے بیان فرمائے کہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ اس کو وراثت میں بھی حصہ دار بنائیں گے۔[1]

داد و دہش اسلام کا حکم ہے کہ صدقات وخیرات میں مسلم اور غیر مسلم کی تمیز درست نہیں ہے۔ اس عام حکم سے یہودی بھی مستثنیٰ نہیں تھے، چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا، ام المومنین حضرت صفیہ یہود خاندانوں میں رشتہ داریاں رکھتی تھیں اور خود صاحب حیثیت بھی تھیں، ایک مرتبہ انھوں نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو تیس ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا۔[2]

---

[1] الادب المفرد امام بخاری باب جار الیہودی۔ یہ روایت ابوداؤد اور ترمذی میں بھی ہے۔
[2] کتاب الخراج قاضی ابویوسف ص ۷۲

عہد نبوی کے غزوات و سرایا
اور
ان کے مآخذ پر ایک نظر

(۱۳)

سعید احمد اکبر آبادی

یہود کی روش

لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر جب یہود کی مخاصمت کے اسباب پر مفصل گفتگو کریں گے بتائیں گے یہ نہ صرف تاریخ یہود کا بلکہ پوری دنیا کا ایک عظیم المیہ[1] ہے کہ یہود پر ان میں سے کسی چیز کا کوئی اثر نہیں ہوا، ان میں چند لوگ انفرادی طور پر مسلمان ضرور ہوئے، اگرچہ ان میں بھی متعدد اشخاص تاریخ وسیر کی کتابوں میں جن کے نام مذکور ہیں منافق نکل گئے، لیکن بحیثیت مجموعی انھوں نے نہ اسلام قبول کیا اور نہ ایک اسلامی ریاست میں پرامن شہری کی حیثیت سے رہنے کا عہد کیا۔ شروع شروع میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے ہیں ان لوگوں نے اس خیال سے حضور کے ساتھ تھوڑا بہت تعاون ضرور کیا کہ آپ ہر بات میں ان کی تائید

---

[1] پروفیسر منٹگری کہتے ہیں: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہود کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا یہود نے اس کی قدر نہ کر کے اپنی قومی زندگی کا ایک زریں موقع ضائع کر دیا۔ اور ہمیشہ مخالفت کرتے رہے اگر وہ ایسا نہ کرتے تو محمد نے ان کے ساتھ جو مراعات کر رکھی تھیں ان کی بنیاد پر وہ عرب امپائر میں شریک ہوتے اور آج دنیا کی تاریخ کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔" (محمد ان مدینہ ص ۲۱۹)

کریں گے اور اس کی وجہ سے ان کو عرب قبائل پر اپنی سیادت اور چودھراہت کے قائم کرنے کا
موقع ملے گا۔ لیکن جب ماہ شعبان ۲ھ میں تحویل قبلہ کا واقعہ پیش آیا اور دوسری طرف قرآن
نے ان کے مزعومات فاسدہ اور اعمال باطلہ پر تنقید کرنی شروع کی تو اب ان لوگوں کو سخت مایو
ہوئی اور یہ مخالفت پر کمربستہ ہوگئے۔ اس سلسلہ میں حضور کے ساتھ شوخ چشمی اور گستاخی
ایذا رسانی بلکہ قتل کا منصوبہ، تعلیمات اسلامی کا استہزار و تمسخر، انصار کو ترک اسلام کی تحریص و
ترغیب، قریش مکہ کے ساتھ ساز باز، شعراء اور اپنے خطیبوں کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم اور اسلام کے خلاف قبیلہ قبیلہ نہایت مکروہ پروپگنڈا، نقضِ عہد، افتراء بہتان، ان میں
وہ کونسی چیز ہے جس میں ان لوگوں نے کوئی کور کسر اٹھا کے رکھی ہو، یہ اور ان کے علاوہ یہود
اور دوسرے اعمال و افعال کو بنیادی طور پر دو قسموں پر منقسم کیا جاسکتا ہے (۱) ایک وہ جو اگرچہ
انتہائی دناءتِ طبع اور بدطینتی کا مظہر ہیں لیکن غدر اور خیانت کے ماتحت نہیں آتے اور (۲) دو
وہ جو غدر، خیانت اور بغاوت و سرکشی میں شامل ہیں، ہم ان دونوں قسموں میں سے نمبر اول پر
گفتگو آگے کسی اور موقع پر کریں گے، اقتضائے مقام سے دوسری قسم کی چند مثالیں یہاں بیان
کرتے ہیں۔

یاد ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں ایک دفعہ صا
صاف یہ بھی تھی کہ وہ (یہود) مسلمانوں کے خلاف ان کے دشمنوں کی مدد کسی طرح بھی نہیں کریں گے
اور اگر مسلمانوں پر حملہ ہوگا تو وہ ان کا ساتھ دیں گے، اتفاق ایسا ہوا کہ ادھر یہ معاہدہ ہوا
اس کے کچھ دنوں بعد ہی تحویل قبلہ کا واقعہ پیش آگیا جس کے بعد یہود نے معاہدہ اور عہد و پیما
سب کو بالائے طاق رکھ کر اسلام کی مخالفت پر کمر ہمت باندھ لی، ابھی ان کا یہ غنچۂ مخالف
ناشگفتہ ہی تھا کہ غزوۂ بدر کا واقعہ پیش آگیا، یہ واقعہ کیا پیش آیا یہود کے گلشن تمنا و آر
کو بادِ بہاری کا پیغام آگیا۔ انھیں یقین تھا کہ اس میں مسلمانوں کو شکست ہوگی اور ان کی ا
بر آئیں گی۔ لیکن وہاں جنگ کا نتیجہ ان کی توقعات کے بالکل برعکس ہوا۔ اگر ان میں کچھ

دور اندیشی اور سلامت روی ہوتی تو یہ ہوا کا رخ پہچانتے اور کم از کم اس معاہدہ کی پابندی کرتے جو حضور کے اور ان کے درمیان تھا اور ایک اسلامی ریاست کے پر امن شہری کی حیثیت سے رہنے کا عزم کرتے، لیکن اس کے برخلاف ہوا یہ کہ اب یہ قابو سے باہر ہو گئے، ان میں اور مشرکین مکہ میں کوئی چیز مشترک نہیں تھی، لیکن اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید مخالفت میں یہود ان لوگوں تک کے ساتھ ساز باز کرتے ہوئے نہ شرمائے، ابن اسحٰق نے قبیلہ وار ان سڑسٹھ (67) افراد و اشخاص کے نام درج کیے ہیں جو بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع وغیرہ قبیلوں میں ممتاز مرتبہ و مقام رکھتے تھے اور حضور کے ساتھ دشمنی میں پیش پیش تھے، متاخر مورخین اور خصوصاً ابن ہشام نے بھی ان لوگوں کے نام قبیلہ وار لکھے ہیں۔

سازشیں غزوۂ بدر کے بعد ان لوگوں کے ایک نمائندہ وفد نے جو بنو نضیر اور دوسرے قبائل یہود کے چیدہ لوگوں پر مشتمل تھا اور جس میں حیی بن اخطب، سلام بن ابی الحقیق، ابورافع، الربیع بن الربیع بن ابی الحقیق، کعب بن اشرف اور ابو عمارہ وغیرہ شامل تھے قریش، غطفان اور بنی قریظہ کا دورہ کیا۔ جب یہ لوگ قریش کے پاس پہونچے تو قریش نے جو مشرکین تھے ان لوگوں سے کہا: "آپ تو احبار یہود ہیں اور اہل کتاب اور صاحب علم ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے اور محمد کے درمیان کیا اختلاف ہے تو آپ یہ تو بتائیے کہ ہمارا دین اچھا ہے یا محمد کا دین" ان علمائے یہود نے جواب دیا "تمہارا دین محمد کے دین سے زیادہ بہتر ہے اور تم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو" قرآن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فوراً متنبہ کیا کہ یہود اہل کتاب ہونے کے باوصف آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اسلام کی دشمنی میں اب اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ انھیں شرک کو بھی دین محمدی سے بہتر قرار دینے میں شرم محسوس نہیں ہوتی۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ	اے محمد کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو
يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ	اہل کتاب ہیں مگر اس کے باوجود بتوں اور شیطان

لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا سَبِيْلًا

کا کلمہ پڑھتے اور کافروں سے کہتے ہیں کہ تم مومنین سے بھی زیادہ ہدایت کے راستہ پر ہو۔

(النساء آیت نمبر ۵۰)

قرآن نے صرف یہی نہیں کیا کہ یہود کی ان شرارتوں اور فتنہ پروری کا پردہ چاک کیا، بلکہ اس کو سننے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے دل میں طبعی طور پر جو اضطراب پیدا ہو سکتا تھا اس آیت کے فوراً بعد حضور کی تسلی وتشفی اور اس تشویش واضطراب کو دفع کرنے کی غرض سے کہا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا

یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت بھیجی ہے اور جن کو اللہ ملعون کرتا ہے آپ ہرگز اس کا کوئی مددگار نہیں پائیں گے۔

یہ آیت اس کی پیش گوئی تھی کہ ان لوگوں کی حرکات کے باعث موت اور ہلاکت ان کے سر پر منڈلا رہی ہے اور جب وہ وقت آپہنچے گا تو کوئی طاقت ان کی مدد نہیں کرسکے گی[1]

لوگوں کو قبول اسلام سے روکنا

اس وفد کے دو رکن جو ایک دوسرے کے بھائی تھے حیی بن اخطب، اور ابو یاسر بن اخطب حد درجہ فتنہ پرور اور شورہ پشت تھے اور لوگوں کو قبولِ اسلام سے روکتے تھے، ابن ہشام کے الفاظ یہ ہیں:

وكانا جاهدين في رد الناس عن الاسلام بما استطاعا[2]

یہ دونوں اپنے مقدور بھر لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے روکتے تھے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۰، تحقیق مصطفیٰ السقا، ابراہیم الابیاری، وعبدالحفیظ الشلبی، یہ واقعہ اس آیت کی تفسیر کے ماتحت ابن جریر طبری، روح المعانی اور تفسیر ابن جوزی میں بھی ہے لیکن مختلف روایات میں مختلف نام ہیں، ہم نے کچھ نام کسی روایت سے اور کچھ نام کسی اور روایت سے لئے ہیں۔

[2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۹۷

اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ الآیۃ

بہتیرے اہل کتاب ہیں جو ان پر حق کے واضح ہوجانے کے بعد بھی اپنے ذاتی حسد کے باعث یہ چاہتے ہیں کہ تم کو ایمان سے ہٹا کر کافر بنا دیں۔

اس سلسلہ میں یہ لوگ حضور کی ذات سے متعلق اس درجہ بیہودہ اور ناشائستہ الفاظ کہتے تھے جن کو یہاں نقل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں لوگوں کے نسبت سورۂ انا اعطیناک الکوثر میں فرمایا گیا:

إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ

جو آپ کے بدخواہ ہیں وہی لنڈورے ہوں گے۔

یہود میں حضرت عبداللہ بن سلام، ثعلبہ بن سعیہ، اسید بن سعیہ اور اسد بن عبید ایسے چند حضرات جو مسلمان ہوگئے تھے ان کی نسبت کہتے تھے کہ "ہم میں سے جن لوگوں نے دین اسلام کو قبول کر لیا ہے وہ ہم میں بدترین آدمی تھے، ورنہ اگر وہ ہمارے اچھے لوگوں میں سے ہوتے تو کبھی اپنے آبائی مذہب کو ترک نہ کرتے۔"[1]

کعب بن اشرف عرب میں پروپگنڈا کا سب سے زیادہ موثر اور کارگر ذریعہ شاعر تھے، جس شخص اور جس قبیلہ کے خلاف یہ چاہتے اپنے اشعار و قصائد سے آگ لگا دیتے تھے۔ یہود میں اچھے اچھے آتش نوا شاعر موجود تھے، پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس حربہ سے کام نہ لیتے، ان بدنصیب شعراء میں کعب بن اشرف نہایت ممتاز مرتبۂ و مقام کا مالک تھا۔ کمال فن کے علاوہ یہ شخص بڑا وجیہ اور حسین و جمیل بھی تھا۔ عورتیں اس کے شعر اور حسن و جمال کا عموماً شکار ہو جاتی تھیں اور یوں بھی قبائل میں اس کا بڑا رسوخ و اثر تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۰۶

اسلام کے ساتھ دشمنی اور عناد میں برابر پیش پیش رہتا تھا۔ غزوۂ بدر کا جو نتیجہ ہوا اس نے کعب بن اشرف کو سخت برہم اور چراغ پا کر دیا، یہود کے جس وفد کا ابھی ذکر آیا ہے اس کے ساتھ یہ مکہ آیا۔ قریش کی تعزیت کی، دلاسا دیا، مقتولین قریش کا مرثیہ لکھا اور مسلمانوں سے اس شکست کا انتقام لینے پر ان کو ابھارا۔ جب مدینہ واپس آیا تو مسلمان خواتین جن میں حضرت میمونہ کی بہن اور حضرت عباس کی زوجہ حضرت لبابہ بنت الحارث الہلالیہ بھی شامل ہیں، کعب بن اشرف ان خواتین کا نام لے کر اپنے اشعار میں ان کے حسن وجمال کی تعریف اور ان کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرنے لگا جس سے مسلمانوں کو سخت اذیت اور تکلیف ہوتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرچند اس کو تنبیہ کی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا[1]

کعب بن اشرف کے علاوہ ابوعفک الیہودی بھی ایک شاعر تھا جو مسلمانوں کی مذمت اور ان کے استہزاء میں اشعار لکھتا تھا اور ان اشعار سے اسلام کے خلاف لوگوں میں جوش پیدا کرتا رہتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک عورت عصما کا بھی نام آتا ہے کہ وہ بھی شاعرہ تھی اور شعر سے اسلام کے خلاف پروپگنڈہ کا کام لیتی تھی۔ شعبہ (شعیبہ؟) بن عمرو بھی اس درجہ کا شاعر تھا کہ یہ صفت اس کے نام کا جز ہوگئی تھی اور لوگ اسی نسبت سے اس کو پہچانتے تھے، یہ بھی اسلام کے خلاف سخت پروپگنڈہ کرتا رہتا تھا[2]

قریش اور غطفان سے معاہدہ

یہود نے مذکورۂ بالا حرکات پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان کے جس وفد کا تذکرہ ابھی گزر چکا ہے اس نے قریش اور غطفان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف باقاعدہ جنگی معاہدہ کیا جس سے بڑھ کر غدر اور خیانت کی کوئی

---

[1] تاریخ طبری ج ۲ ص ۴۸۷ ۔ وکتاب المنازل والدیار از اسامۃ بن مرشد بن علی ج ۱ ص ۱۰۹ تا ۱۱۳ وسیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۵۴

[2] تاریخ العرب قبل الاسلام ج ۴ ص ۱۴۰ ۔

اور تسم نہیں ہوسکتی۔ سیرت ابن ہشام میں صاف تصریح ہے:

وقالوا: انا سنکون معکم حتی نستاصلہٗ | اور انھوں نے (قریش سے) کہا کہ تم جنگ کرو ہم تمھاری مدد کریں گے اور محمد کا قلع قمع کر دیں گے

یہی الفاظ بعینہٖ انھوں نے قبیلۂ غطفان سے بھی کہے ہیں۔[1]

مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی جدوجہد

اس سلسلہ میں انھوں نے اس کی بھی کوشش کی کہ کسی طرح مسلمانوں میں آپس میں پھوٹ پڑ جائے اور ان میں وہ اتحاد ویگانگت باقی نہ رہے جو اسلام نے ان میں پیدا کر دی تھی، چنانچہ ایک مرتبہ انصار جو اوس وخزرج کے قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے، کسی ایک جگہ بیٹھے آپس میں گفت وشنید کر رہے تھے، اسی اثنا میں ایک عمر رسیدہ اور مسلمانوں کا سخت دشمن یہودی جس کا نام شاس بن قیس تھا۔ ادھر سے گذرا تو مسلمانوں کی اس باہمی محبت وخلوص کو دیکھ کر سراپا غیظ وغضب بن گیا، ایک یہودی نوجوان جو اس کے ہمراہ تھا اس سے کہا: تو ذرا ان لوگوں (مسلمانوں) کی مجلس میں جاکر بیٹھ، پھر موقع پاکر جنگ بُعاث[2] اور اس سے پہلے کی حالت کا ذکر چھیڑ دے اور اس سلسلے میں دونوں طرف کے شاعروں نے جو سخت اشتعال انگیز شعر کہے ہیں وہ اس مجلس میں پڑھ کر سنا۔ نوجوان نے حکم کی تعمیل کی، نتیجہ یہ ہوا کہ انصار میں اشتعال پیدا ہو گیا، اوس اور خزرج میں جو واقعات پیش آئے تھے ان کی یاد دماغوں میں پھر تازہ ہوگئی۔ دونوں طرف سے ایک ایک شخص نکلا، ایک نے دوسرے کو چیلنج کیا اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۲۲۵ و ۲۲۶

[2] ہجرت نبوی سے پہلے یہ شدید جنگ اوس اور خزرج میں برپا ہوئی تھی اور اس میں اوس کو خزرج پر فتح ہوئی تھی اور ان دونوں قبیلوں کے سرخیل وسرغنہ مارے گئے تھے۔ یہ جنگ تاریخی اعتبار سے نہایت اہم تھی۔ تاریخ کی کتابوں میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے

فوراً تشریف لائے، آپ کے ساتھ مہاجرین کا ایک گروہ بھی تھا۔ آتے ہی آپ نے ایک نہایت موثر تقریر کی اور فرمایا: مسلمانو! خدا سے ڈرو، خدا سے ڈرو، تم یہ عہد جاہلیت کی سی باتیں بڑھ بڑھ کر کیا کر رہے ہو! حالانکہ میں ابھی تک تمھارے درمیان موجود ہوں، یہ سب کچھ تم اس وقت کر رہے ہو جب کہ اللہ تعالیٰ تم کو اسلام کا راستہ دکھا چکا۔ تم کو اس سے مشرف اور مکرم بنا چکا اور جاہلیت کی باتوں سے تم کو دور کر چکا ہے، اس کے ذریعہ اللہ نے تم کو کفر سے نجات دی اور تمھارے دلوں میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا جذبہ پیدا کر دیا، انصار پر اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ رونے لگے، فوراً وسوسۂ شیطانی کو دماغ سے نکالا اور آپس میں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے، اس کے بعد یہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ واپس آ گئے۔[۱]

---

[۱] سیرتِ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۰۵

عہد نبوی کے غزوات و سرایا

اور

ان کے ماٰخذ پر ایک نظر

(۱۴)

سعید احمد اکبر آبادی

مسلمانوں کا اقتصادی بائیکاٹ یہود مالدار اور کاروباری لوگ تھے، اس لئے مسلمانوں کا بھی ان سے لین دین تھا۔ عام خرید و فروخت کے علاوہ مسلمان یہود سے روپیہ قرض لیتے اور ان کے پاس اپنی امانتیں بھی رکھتے تھے، غزوۂ بدر کے بعد انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی دشمنی میں جو اقدامات کئے ان میں ایک مسلمانوں کا اقتصادی اور معاشی مقاطعہ بھی تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ یہود کے پاس مسلمانوں کی جو امانتیں رکھی تھیں یا ان کے ذمہ مسلمانوں کا جو قرض روپیہ تھا۔ یا یہ خود مسلمانوں کو جو روپیہ ادھار پر دیتے تھے، یہ سب انھوں نے ترک کر دیا۔ اور باہم عہد کیا کہ اب وہ آئندہ نہ مسلمانوں کا قرض ادا کریں گے اور نہ ان کی امانتیں واپس کریں گے۔ منافقین برادر گرگ شغال کے مصداق ان کے ہم مشرب و ہم مسلک تھے ہی ان کو بھی اس پر آمادہ کیا کہ وہ لوگوں میں مسلمانوں کے اقتصادی مقاطعہ کا پروپگنڈا کریں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنفِقُوا عَلَىٰ مَنْ　　یہی وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ کے اردگرد

عِندَ رَسُولِ اللّٰہِ حَتّٰی یَنفَضُّوا۔ (المنافقون ۷)

جو لوگ جمع ہیں (یعنی مسلمان) ان پر تم خرچ نہ کرو تا آنکہ یہ منتشر ہوں۔

خاص یہود سے متعلق اس سلسلہ میں فرمایا گیا:

ومن اهل الکتاب من ان تامنه بقنطار یؤدہ الیک ... الا مادمت علیه قائما، ذالك بانهم قالوا: لیس علینا فی الامیین سبیل، ویقولون علی اللہ الکذب، وھم یعلمون ○ (آل عمران)

اہل کتاب میں بعض وہ لوگ ہیں کہ اگر آپ سونے کا ایک توڑا بھی ان کے پاس امانت رکھیں تو وہ اس امانت کو واپس کر دیں گے اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں کہ اگر ایک اشرفی بھی ان کے پاس بہ طور امانت رکھیں تو وہ اس کو اس وقت تک آپ کے حوالہ نہیں کریں گے جب تک آپ ہر وقت ان کے سر پر کھڑے نہ رہیں گے، ان کی یہ حرکات اس لیے ہیں کہ یہ لوگ کہتے ہیں: ہم پر توامیوں کا کوئی بس چلتا نہیں ہے اور یہ لوگ اللہ پر افترا اور بہتان باندھتے ہیں حالانکہ وہ خود جانتے ہیں

لہ یہود اور منافقین آئے دن جلی کٹی باتیں کرتے رہتے تھے جو سخت اشتعال انگیز ہوتی تھیں لیکن قرآن کی زبان اور انداز بیان کا ایک وصف امتیازی یہ بھی ہے کہ جب اس نے یہود اور منافقین کی کسی بات کا جواب دیا ہے تو اس میں تین چیزوں کا لحاظ لازمی طور پر رکھا ہے،

(۱) ایک یہ کہ کسی کا نام نہیں لیا (۲) دوسرے یہ کہ اس میں دینی پہلو کو ضرور نمایاں کیا گیا ہے، اور (۳) تیسرے یہ کہ لب ولہجہ نہایت معتدل اور متین وسنجیدہ رہا ہے، چنانچہ اس موقع پر بھی دیکھئے، منافقین کی اس سخت بات کے جواب میں قرآن کا جواب کس درجہ ٹھنڈا، متین مگر عبرت آموز ہے، فرمایا گیا:

(باقی اگلے صفحہ پر)

مفسرین اس آیت کا سبب نزول یہ بتاتے ہیں کہ یہود کا عربوں کے ساتھ لین دین تھا۔ جب عربوں میں اسلام پھیلنا شروع ہوا تو یہود نے آپس میں کہا کہ مسلمان عربوں کی جو رقمیں تم پر واجب الادا ہیں یا ان کی جو امانتیں تمھارے پاس رکھی ہوئی ہیں اب ان کو واپس نہ کرنا۔ کیونکہ اب ان لوگوں نے مسلمان ہو کر اپنا یہ حق کھو دیا اور مزید برآں کہا کہ توراۃ میں بھی یہی ہے۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

اب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہود کی سخت معاندانہ اور مخالفانہ سرگرمیوں کو اس توقع پر نظر انداز کرتے رہے تھے کہ شاید وہ راہ راست پر آجائیں۔ لیکن غزوۂ بدر کے بعد مزید مسامحت اور چشم پوشی کرنا ممکن نہ تھا، کیونکہ غزوۂ بدر میں عظیم الشان فتح نہ صرف عرب بلکہ پوری دنیائے کفر و شرک کے لئے ایک عظیم چیلنج تھی، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین تھا کہ غزوۂ بدر آخری جنگ نہیں ہے، بلکہ اس کے بعد اور اس سے بھی بڑی اور سخت تر جنگوں سے سابقہ پڑے گا، اس حالت میں اگر اندرون مدینہ یہود اپنی باغیانہ سرگرمیوں کے ساتھ آزاد اور قائم رہے تو وہ مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا سکتے ہیں، اس لئے ضروری تھا کہ دوسری جنگوں کے شروع ہونے سے پہلے یہود کے معاملہ سے نمٹ لیا جائے۔

بنو قینقاع

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، مدینہ اور اس کے گرد و نواح میں یہود کے چھوٹے بڑے متعدد قبائل آباد تھے، لیکن ان میں سب سے زیادہ با اثر،

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝

حالانکہ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ ہی کا تو ہے، پھر بھی منافق سمجھتے نہیں ہیں۔

[1] تفسیر روح المعانی ج ۳ ص ۲۰۲ و تفسیر ابن جریر طبری و تفسیر قرطبی وغیرہ۔

طاقتور اور یہود کے سرخیل و سرغنہ تین قبیلے ہی تھے ، بنو نضیر ، بنو قریظہ ، اور بنو قینقاع ، اول الذکر دونوں قبیلے مدینہ کے بیرونی حصہ میں آباد تھے اور ان کے بڑے بڑے اور محفوظ قلعے تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے ، لیکن بنو قینقاع کی پوزیشن ان دونوں سے مختلف تھی ، یہ لوگ جن کی تعداد ۱۰۰۰ ایک ہزار کے لگ بھگ تھی وسط شہر میں رہتے تھے ان کے محلے مسلمانوں کے محلے سے ملے جلے تھے اور بعض محلوں میں آبادی مشترک تھی ان کا خاص پیشہ صنعت و حرفت اور تجارت تھی چنانچہ مدینہ کے ایک بازار کا نام ہی "سوق بنی قینقاع" یعنی "بنی قینقاع مارکیٹ" تھا۔ اس بنا پر دور اندیشی اور مصلحت شناسی کا تقاضا تھا کہ سب سے پہلے اس قبیلہ کی طرف توجہ کی جائے۔

علاوہ ازیں یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے جو معاہدہ کیا تھا اس کو توڑنے اور اس کی خلاف ورزی کرنے میں پیش پیش تھے۔ چنانچہ مورخین کا بیان ہے :

وکان اول من نقض العهد بينه و بين رسول الله صلى الله عليه وسلم وغدر من يهود بنو قينقاع[1]

یہود کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان جو معاہدہ تھا اس کو یہود میں سب سے پہلے جس نے توڑا اور غداری کی وہ بنو قینقاع ہیں۔

یہ ابن اسحٰق کا بیان ہے جس کو ابن ہشام اور طبری نے بھی نقل کیا ہے۔ ابن سعد نے اس پر مزید اضافہ یہ کیا ہے :

فلما كانت وقعة بدر اظهروا البغى والحسد ونبذوا العهد

جب واقعۂ بدر ہو چکا تو قینقاع نے بغاوت اور حسد کا اظہار کیا اور عہد پس پشت ڈال دیا

---

[1] الدرر لابن عبد البر ص ۱۵۰

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بدر سے واپس تشریف لائے تو بنو قینقاع آپ کے پاس آئے اور بولے : محمد! تم نے اپنی قوم قریش کو میدانِ بدر میں شکست دے کر ان کی جو گت بنائی ہے تم اس پر مغرور نہ ہو جانا۔ کیونکہ انھیں لڑنا نہیں آتا، ہاں البتہ! خدا کی قسم! اگر تم نے ہم سے جنگ کی تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم کون لوگ ہیں[1]۔ یہ روایت بھی ابن اسحٰق کی ہے جس کو ابن عبدالبر نے نقل کیا ہے، لیکن عام روایت یہ ہے کہ آنے میں پہل بنو قینقاع نے نہیں کی تھی بلکہ غزوۂ بدر کے بعد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی آبادی میں پہونچے، ان سب کو جمع کیا اور فرمایا: "اے بنو قینقاع! تم نے دیکھ لیا کہ بدر میں قریش کا انجام کیا ہوا! اب میں تم کو خبردار کرتا ہوں کہ تم اپنی سرگرمیوں سے باز آجاؤ اور میری اطاعت قبول کرلو۔ ورنہ تمھارا انجام بھی وہی ہوگا جو قریش کا ہوا۔" حضور کی اس تقریر کے جواب میں انھوں نے وہی بات کہی جو اوپر مذکور ہو چکی ہے[2]۔ ہمارے نزدیک یہی روایت زیادہ صحیح اور قرینِ قیاس ہے۔

اسی اثنا میں ایک اور واقعہ پیش آگیا جو اگرچہ معمولی ہے، لیکن انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ دنیا میں جتنی بڑی بڑی جنگیں ہوئی ہیں ان کا آغاز ایک معمولی واقعہ سے ہوا ہے، چنانچہ یہی واقعہ بنو قینقاع پر فوج کشی کا سبب ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک مسلمان خاتون سوق بنی قینقاع گئی تھیں، وہاں ایک یہودی زرگر کی دکان پر نقاب پوش بیٹھی تھیں۔ یہود نے ان کی چہرہ کشائی کرنی چاہی، جب انھوں نے سختی کے ساتھ اس کی مقاومت کی تو زرگر نے ایسی ناشائستہ حرکت کی کہ عورت کا ستر کھل گیا، عورت نے شور مچایا اور چیخی تو مسلمان جمع ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے جنگ کا اعلان کیا اور بنو قینقاع

---

[1] الدرر لابن عبد البر ص ۱۵۰

[2] سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۵۰

پر چڑھائی کر دی[1]

بنو قینقاع کو اپنی طاقت و قوت اور فن سپہ گری پر بڑا ناز تھا۔ لیکن اب لشکر اسلام کو حملہ آور دیکھا تو روبرو ہو کر لڑنے کی ہمت نہیں ہوئی اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ لشکر اسلام نے ان کا محاصرہ کر لیا، محاصرہ کو دو ہفتے ہوئے تھے کہ عبد اللہ بن ابی بن سلول جو رئیس المنافقین تھا اور چونکہ قبیلۂ خزرج بنو قینقاع کا حلیف تھا اور عبد اللہ بھی خزرجی تھا اس لئے اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بنو قینقاع کے ساتھ حسن معاملہ کی سفارش کی لیکن آپ نے اس پر توجہ نہیں کی اور سنی ان سنی کر دی، عبد اللہ نے از راہ استرحام اب آپ کی زرہ کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اسی درخواست کا پھر اعادہ کیا۔ حضور نے فرمایا: "ارسلنی" تو مجھے چھوڑ دے، راوی کا بیان ہے کہ اس وقت حضور اس درجہ غضب ناک تھے کہ چہرہ پر سیاہ چھائیاں نظر آ رہی تھیں، اسی غصہ کے عالم میں آپ نے دوبارہ فرمایا: "بد بخت! پرے ہٹ!" عبد اللہ بن ابی نے جواب دیا "خدا کی قسم! میں یہاں سے ہرگز نہیں ہٹوں گا جب تک آپ میری خاطر ان کی جان بخشی نہیں کر دیں گے!" اس پر ارشاد ہوا: "اچھا جا! تیری خاطر ان کی جان بخشی کی جاتی ہے" اور اب آپ نے ان کو جلا وطن کرنے کا حکم دیا، عورتوں اور مردوں سب کو ملا کر ان کی تعداد ایک ہزار تھی، شام کے علاقہ میں ایک مقام اذرعات تھا۔ ہتیاروں

---

[1] اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام میں عورتوں کے ناموس اور ان کی حرمت وعزت کا کس درجہ پاس اور لحاظ ہے۔ چنانچہ سندھ پر محمد بن قاسم کی فوج کشی کا واقعہ بھی اسی طرح پیش آیا۔ مسلمانوں کا ایک قافلہ بحر ہند سے گذر رہا تھا کہ بحری ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے اس پر حملہ کیا اور ایک عورت کو گرفتار کر لیا، عورت نے خلیفۂ اسلام (ولید بن عبد الملک) کی دہائی دی جو خلیفہ تک پہونچ گئی خلیفہ نے سندھ کے حکمران راجہ داہر کو احتجاجی خط لکھا۔ جب اس کا جواب نہیں آیا تو محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ پر چڑھائی کر دی، پھر اس کا جو نتیجہ ہوا سب کو معلوم ہے۔

کے سوا سب چیزیں لے جانے کی اجازت تھی، یہ لوگ وہاں جاکر آباد ہوگئے۔ غور کرنا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، مسلمانوں اور اسلام کے اس قدر شدید دشمن اور فتنہ پرور! اور پھر مال ومتاع کے ساتھ اس طرح سلامتی کے ساتھ جلاوطن کئے جاتے ہیں کہ ان کی نکسیر بھی نہیں پھوٹتی اور کسی ایک فرد کا بھی جانی نقصان نہیں ہوتا! کیا دنیا میں کسی ایک حکومت نے بھی اپنے باغیوں اور غداروں کے ساتھ حسن سلوک کا ایسا معاملہ کیا ہے؟ طبری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نگرانی اور تکمیل کے لئے ایک افسر بھی مقرر کر دیا تھا جن کا نام عبادہ بن صامت تھا، یہ واقعہ غزوۂ بدر کے کچھ ہی دنوں بعد یعنی ماہ شوال ۲ھ میں پیش آیا۔ قرآن کی آیت ذیل اسی واقعہ سے متعلق ہے:

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ

(الانفال)

اگر آپ کو کسی قوم کی طرف سے خیانت کا اندیشہ ہو تو ایسے کو تیسا کے قانون کے مطابق یہ خیانت انھیں کے سر دے ماریئے، اور اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ایک تحقیق

بنو قینقاع کا قصہ تو ختم ہوگیا، لیکن اس سلسلہ میں ایک لفظ کے معنیٰ تحقیق طلب ہیں۔ تاریخ وسیر کی بعض کتابوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بنو قینقاع کے پاس گئے تو آپ نے فرمایا:

یامعشر یهود، احذروا من الله مثل ما نزل بقریش من النقمة واسلموا، فانکم قد عرفتم انی نبی مرسل، تجدون ذالك فی کتابکم وعهد الله الیکم

(سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۵۰)

اے یہود کے ایک گروہ! قریش پر (غزوۂ بدر میں) جو افتاد پڑی ہے تم اللہ سے ڈرو کہ کہیں تم پر بھی نہ آپڑے، اور تم اطاعت قبول کرو، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں۔ یہ بات اور اللہ نے تم سے جو عہد لیا ہے یہ سب تم اپنی کتاب میں پاتے ہو۔

کوتاہ بینوں نے اس ارشاد کا مطلب یہ لیا ہے کہ "پیغمبر اسلام نے بنو قینقاع کو دھمکی دی کہ اگر انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تو ان کا انجام وہی ہوگا جو قریش کا ہوا۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے" عیسائی مشنریز کا خصوصًا اور عام معترضین کا عمومًا یہ ایک مشہور اعتراض ہے، اس لئے ہم ذرا تفصیل سے اس پر گفتگو کریں گے۔

کیا اسلام تلوار سے پھیلا ہے

اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہیے کہ اس معاملہ میں قرآن میں حکم کیا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ قرآن سراپا دعوتِ اسلام ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غرضِ بعثت ہی دعوتِ اسلام ہے لیکن پورے قرآن میں کہیں ایک جگہ بھی صراحۃً واشارۃً یہ نہیں کہا گیا کہ جو لوگ اسلام قبول نہیں کرتے ان کے خلاف اعلان جنگ کر دینا چاہیے۔ قرآن میں تفصیل کے ساتھ جنگ اور اس کے احکام کا تذکرہ اور اس سلسلہ میں ہدایات کا بیان ہے۔ لیکن جنگ کی بنیاد بجز اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنی، ایذارسانی، غدر، خیانت اور شدید مخاصمانہ حرکات و اعمال کے کوئی اور چیز نہیں بتائی گئی، جہاں تک اسلام قبول نہ کرنے کا تعلق ہے تو ایک دو مرتبہ نہیں بار بار آنحضرت کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر لوگ آپ کی دعوت قبول نہ کریں تو آپ ان کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیجئے اور آپ صبر کیجئے[1]۔ ایک جگہ فرمایا گیا:

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ	اگر لوگ آپ کی بات نہ مانیں تو آپ کہہ دیجئے کہ اللہ میرے لئے کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اس پر بھروسہ کیا ہے اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔

---

[1] اس موضوع پر مضمون کی کسی ابتدائی قسط میں بھی گفتگو ہو چکی ہے، مگر بہت مختصر!

ایک مقام پر فرمایا گیا:

إِنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ ۝ (الزمر)

ہم نے سچائی کے ساتھ لوگوں کے فائدہ کے لئے آپ پر قرآن اتارا ہے، تو اب جو کوئی ہدایت یافتہ ہوگا تو اپنے لئے ہوگا۔ اور جو گمراہ ہوگا وہ اپنے لئے ہوگا۔ اور اے پیغمبر! آپ ان لوگوں کے ٹھیکہ دار تو نہیں ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہوا:

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝ (الزخرف)

(اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں) تو آپ ان سے درگزر فرمائیں اور کہدیں "سلام" یہ عنقریب جان جائیں گے۔

ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۝ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ ۗ (الشوریٰ)

اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو ہم نے آپ کو ان کا نگراں تو بنا کر نہیں بھیجا ہے آپ کا فرض تو بس پہونچانا ہے۔

بہرحال یہ اور اسی جیسی اور متعدد آیات سے یہ بالکل صاف ظاہر اور ثابت ہے کہ اسلام قبول نہ کرنے پر نہ صرف یہ کہ جنگ کرنے کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ ایسے مواقع پر حکم یہ ہے کہ آپ صبر کریں، چشم پوشی اور درگذر سے کام لیں بلکہ یہاں تک حکم دیا گیا کہ اس پر آپ غصہ کا بھی اظہار نہ کریں اور منکرین سے سخت اور درشت لب ولہجہ سے بات بھی نہ کریں "وقل سلامٌ"

پس جب حکم یہ ہے تو بنو قینقاع کے ساتھ گفتگو کرتے وقت آپ کے لئے یہ کہنا کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ "تم اسلام قبول کرلو، ورنہ قریش کا جو حشر ہوا وہی تمہارا بھی ہوگا۔"

اسلموا کے معنیٰ

اچھا اگر "اسلموا" کے معنی یہ نہیں تو پھر کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی ہے وہاں ہمیشہ آمِنُوْا "تم ایمان لاؤ" فرمایا گیا ہے، کوئی ایک موقع بھی ایسا نہیں ہے کہ "اسلموا" بصیغۂ امر "اسلام قبول کر لو" کے معنی میں بولا گیا ہو۔ اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ قرآن سے ثابت ہے کہ ایمان اور اسلام میں عام خاص کی نسبت ہے، ایمان خاص اور اسلام عام۔! اس بنا پر جہاں کہیں ایمان ہوگا اسلام ضرور ہوگا۔ لیکن اسلام کے ساتھ ایمان کا ہونا ضروری نہیں ہے، چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ط قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا، وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ ط (الحجرات)

دیہاتی عرب کہتے ہیں: "ہم ایمان لائے ہیں" اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو "ہاں البتہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں" اور ایمان کا تو اب تک تمہارے دلوں میں گذر بھی نہیں ہوا۔

قرآن کی اس آیت سے ایمان اور اسلام میں جو فرق ہے اس کی تائید صحیح مسلم کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں اس کا ذکر ہے کہ ایک اعرابی خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے اسلام اور ایمان اور احسان کی حقیقت الگ الگ دریافت کی، پس جب ایمان اور اسلام دونوں لفظ ہم معنی نہیں اور اسلام کا اقرار کر لینے سے مومن ہو جانا لازم نہیں آتا جو عین مطلوب و مقصودِ شریعت ہے تو پھر ظاہر ہے طلب ایمان کے موقع پر قرآن "اسلموا" کا لفظ کیونکر بول سکتا تھا۔

صیغۂ امر اور صیغۂ ماضی یا صیغۂ اسم فاعل کے ساتھ قرآن مجید میں اسلام سے مشتق ہو کر جو لفظ آئے ہیں اطاعت اور فرماں برداری کے معنی میں آئے ہیں۔ مثلاً اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (البقرہ) جب اس کے پروردگار نے اس سے کہا:

کہ تو اطاعت قبول کر تو اس نے کہا: میں نے رب العلمین کی اطاعت قبول کی، ونحن لہ مسلمون (البقرہ) ہم اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں "فلما اسلما" جب دونوں (حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل) اطاعت بجالائے وغیرہ وغیرہ! لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احادیث میں بھی "اسلموا" بصیغۂ امر "اسلام قبول کرو" کے معنی میں کہیں مستعمل نہیں ہوا ہے، نہیں ایسا آیا ہے اور ضرور ہوا ہے، البتہ "اطاعت قبول کرو" کے معنی میں بھی اس کا استعمال عام رہا ہے،

اس بنا پر معنی کا تعین سیاق وسباق اور قرینہ کی روشنی میں ہوگا۔ اب بنو قینقاع سے گفتگو کا ماحول دیکھئے تو صاف معلوم ہوگا کہ حضورؐ نے یہاں "اسلموا" کا لفظ "اطاعت کرو" کے معنیٰ میں استعمال کیا ہے نہ کہ مذہب اسلام کو اختیار کر لینے کے معنی میں، اس بنا پر اب آپ کے پورے ارشاد کا مطلب یہ ہوا: کہ تم لوگ نقض عہد کر کے جو غدر اور خیانت کے اعمال وافعال کا ارتکاب کر رہے ہو تو میں تم کو متنبہ کرتا ہوں کہ ان سے باز آجاؤ اور میری اطاعت قبول کر لو۔ (یعنی پرامن شہریوں کی طرح رہو) اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو قریش کا انجام تمہارے سامنے ہی ہے، اس سے تم کو سبق لینا چاہیئے، پھر کلام میں مزید قوت پیدا کرنے کے لئے فرمایا: تم یہ نہ سمجھنا کہ قریش پر میری فتح صرف بخت واتفاق کا نتیجہ ہے، نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اس لئے ہے کہ میں نبی مرسل ہوں اور خود تمہاری کتاب توراۃ میں مذکور ہوں۔

کعب بن اشرف کا قتل

بنو قینقاع سے مطمئن ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشخاص وافراد کی طرف توجہ کی جو شخصی طور پر قبیلہ قبیلہ میں اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سخت پروپگنڈا کر رہے اور حضور کی طرف سے تنبیہ کے باوجود اپنی حرکات سے باز نہیں آرہے تھے، اور آخر آپ نے ان افراد کو واجب القتل قرار دیا۔ ان لوگوں میں سب سے ممتاز اور نمایاں کعب بن اشرف تھا۔ جس کا مختصر حال ابھی گذر چکا ہے، چونکہ یہ اپنے قبیلہ میں بڑا بارسوخ واثر تھا اس لئے اس کا قتل کر دینا آسان نہیں تھا، محمد بن مسلمہ جو قبیلۂ عبدالاشہل کی شاخ حارثہ سے تعلق رکھتے اور کعب بن اشرف کے

دودھ شریک بھائی تھے انھوں نے اس کارخطیر کو انجام دینے کی پیش کش کی اور حضورؐ نے اسے قبول فرمالیا۔ محمد بن مسلمہ نے اپنے ساتھ تین آدمیوں کو اور شریک کیا جن میں ایک ابونائلہ بھی تھے جو محمد بن مسلمہ کی طرح قبیلۂ عبدالاشہل سے تعلق رکھتے اور کعب بن اشرف کے دودھ شریک بھائی بھی تھے۔ محمد بن مسلمہ جب روانہ ہونے لگے تو عرض کیا: حضورؐ! اس کام سے عہدہ برآ ہونے میں کچھ جتن بھی کرنا ہوگا! ارشاد گرامی ہوا: "تمھیں اجازت ہے" چنانچہ یہ رات کے وقت جبکہ چاندنی چٹکی ہوئی تھی کعب بن اشرف کی گڑھی پہونچے، کعب اپنی نئی دلہن کے ساتھ دادِ عیش دے رہا تھا۔ اسے آواز دے کر باہر بلایا۔ کچھ دور اسے ساتھ لے کر چلے، تقریب ملاقات یہ بتائی کہ مدینہ میں نئی سیاسی صورت حال کے باعث اناج کا بڑا اکال ہوگیا ہے، اور اس کی وجہ سے سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس لئے وہ غلہ کی امداد لینے آئے ہیں۔ کعب اسلحہ کے گروی رکھنے کے بدلہ میں اس پر راضی ہوگیا، اس گفت وشنید میں کعب ان لوگوں کے ساتھ مکان سے ذرا فاصلہ پر رہا۔ اسی اثنا میں محمد بن مسلمہ اور ان کے ساتھیوں نے موقع پاکر اس کا کام تمام کردیا اور جھٹ آ بارگاہ نبوی میں اس کی اطلاع کی۔ ان لوگوں نے جس جی داری اور ہمت وجرأت کا مظاہرہ کیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس کی داد دی، اس واقعہ نے یہود میں دہشت پھیلادی، اب ان میں سے ہر شخص کو اپنا انجام نظر آرہا تھا اور لرزہ براندام تھا[۱]۔ یہ واقعہ ۱۴ ربیع الاول ۳ھ کو پیش آیا۔

کعب بن اشرف ایک رومانوی شخصیت کا انسان تھا اس لئے بعض مورخین سیرت نے

---

[۱] سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۵۴-۶۰ یہ واقعہ صحیح بخاری میں مغازی کے تحت مفصل طور پر مذکور ہے، اور صحیح مسلم، سنن ابی داؤد۔ مسند امام احمد بن حنبل میں بھی اس کا تذکرہ ہے، کتب حدیث کے علاوہ تاریخ وسیر اور شعر وادب کی کتابوں میں بھی کعب بن اشرف اور اس کے اشعار کا ذکر موجود ہے۔

اُس کے حالات اور اُس کے قتل کا واقعہ لکھنے میں افسانہ طرازی سے کام لیا ہے اور محمد بن مسلمہ نے اپنے مشن پر روانہ ہونے سے پہلے حضورؐ سے "جتن" کرنے کی جو اجازت لی تھی اس کی عجیب وغریب تشریح کی ہے، ہم یہاں اس کو نقل کرنا بھی پسند نہیں کرتے، البتہ یہ گزارش کرنا ضروری ہے کہ کعب بن اشرف کے قتل کا جو واقعہ ہم نے لکھا ہے، بعینہ یہی واقعہ پروفیسر واٹ منٹگمری نے لکھا ہے (محمد ان مدینہ ص ۲۱۰) اس سے ان مسلمان مورخین کو عبرت ہونی چاہیئے جو معروضیت کے شوق میں ان روایتوں کے نقل کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت پر حرف آتا ہو، اگرچہ یہ روایات روایت اور درایت کے اعتبار سے کیسی ہی مجروح اور ناقابل اعتماد ہوں۔

عہد نبوی کے غزوات و سرایا

اور

ان کے مآخذ پر ایک نظر

(۱۵)

سعید احمد اکبر آبادی

بنو نضیر کی جلاوطنی جہاں تک یہود کے معاملات کا تعلق ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قینقاع کے بعد قبیلۂ بنو نضیر کی طرف توجہ کی، یہ لوگ جو مدینہ کے شمال میں رہتے اور املاک وجائیداد اور نفوذ و اقتدار کے مالک تھے اپنے ہم مذہبوں کی طرح اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید دشمن اور سخت فتنہ پرداز تھے، ایک طرف، جیسا کہ گذر چکا ہے، قریش اور دوسرے دشمنِ اسلام قبائل کے ساتھ ان کو ربطِ خاص تھا اور دوسری جانب خود مدینہ میں منافقین سے ساز باز رکھتے اور ان کے ذریعہ اسلام کو نقصان پہونچانے کی جو تدبیر اور کوشش بھی وہ کرسکتے تھے اس میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے۔

ان کی یہ طبیعت اور فطرت تھی ہی کہ ادھر صورت حال یہ پیش آگئی کہ جنگ بدر نے قبائلِ عرب پر مسلمانوں کی طاقت وقوت اور ان کے رعب و داب کی جو ڈھاک بٹھادی تھی وہ جنگِ احد کے نتیجہ سے مجروح ہوگئی اور اب ان کو مسلمانوں کے خلاف عملاً سر اٹھانے کی پھر ہمت وجسارت ہوئی، گویا وقتی طور پر ان پر جو سہم طاری ہوگیا تھا وہ جاتا رہا اور انھوں نے پھر ریشہ دوانی، چھیڑ چھاڑ، اور

فساد انگیزی کا سلسلہ شروع کر دیا، چنانچہ ارباب سیر کی اصطلاح کے مطابق غزوۂ احد کے بعد کے جن واقعات کو سریہ یا غزوہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً سریہ ابی سلمہ (یکم محرم الحرام ۴ھ) سریۂ ابن انیس (محرم ۴ھ) سریۂ بیر معونہ (صفر ۴ھ) اور سریۂ الرجیع یہ سب اسی کے شاخسانے ہیں۔[1]

ادھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا کہ اچانک ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس نے بنو نضیر کو بالکل عریاں کر دیا اور اب ان کی طرف سے چشم پوشی کرنا ناممکن ہوگیا ہوا یہ کہ "صفر ۴ھ میں ابو براء کلابی، جو قبیلۂ کلاب کا رئیس تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ چند لوگوں کو میرے ساتھ کر دیجئے کہ قوم کو اسلام کی دعوت دیں، آپ نے فرمایا: "مجکو نجد کی طرف سے ڈر ہے" ابو براء نے کہا: "ان کا میں ضامن ہوں" آپ نے منظور فرمایا اور ستر[2] انصار ساتھ کر دیئے۔ یہ لوگ نہایت مقدس اور درویش تھے اور اکثر اصحاب صفہ میں سے تھے، ان کا معمول تھا کہ دن بھر لکڑیاں چنتے، شام کو فروخت کر کے کچھ اصحاب صفہ کے نذر کرتے، کچھ اپنے لئے رکھتے۔

ان لوگوں نے بیر معونہ پہنچ کر قیام کیا اور حرام بن ملحان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط دیکر عامر بن طفیل (بن مالک بن جعفر کلابی عامری) کے پاس بھیجا جو قبیلہ کا رئیس تھا، عامر نے حرام کو قتل کر دیا اور آس پاس کے جو قبائل تھے، یعنی عصیہ، رعل اور ذکوان، سب کے پاس

---

[1] ان سرایا کا ذکر سب ہی ارباب سیر نے کیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس وضاحت اور خوبی سے ان سرایا کے اسباب وعلل کے ساتھ ان کا ذکر مولانا شبلی نے کیا ہے، کسی نے بھی نہیں کیا۔ چونکہ ان سرایا کا جوڑ بنی نضیر کے واقعہ کے ساتھ مل جاتا ہے اس لئے ہم سفارش کرتے ہیں کہ اس موقع پر قارئین کرام سیرت النبی حصہ اول از ص ۳۸۸ تا ص ۴۰۸ کا مطالعہ ضرور کرلیں، حقیقت بالکل واضح ہو جائے گی۔

[2] روایات میں تعداد چالیس بھی ہے اور ستر بھی، لیکن صحیح بخاری میں تعداد ستر ہی ہے (باب غزوۃ الرجیع ورعل وذکوان وبئر معونۃ)

آدمی دوڑا دیے کہ تیار ہو کر آئیں، ایک بڑا لشکر تیار ہو گیا، اور عامر کی سرداری میں آگے بڑھا صحابہ حرام کی واپسی کے منتظر تھے، جب دیر لگی تو خود روانہ ہوئے، راستہ میں عامر کی فوج کا سامنا ہوا، کفار نے ان کو گھیر لیا اور سب کو قتل کر دیا، صرف عمرو بن امیہ کو یہ کہکر چھوڑ دیا کہ میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی، میں تجھکو آزاد کرتا ہوں، یہ کہہ کر ان کی چوٹی کاٹی اور چھوڑ دیا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس قدر صدمہ ہوا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا۔ مہینہ بھر نماز فجر میں ان ظالموں کے حق میں بد دعا کی۔ (سیرت النبی حصہ اول ص ۳۹۰)

حضرت عمرو بن امیہ ضمری جب مدینہ واپس جانے کے لئے روانہ ہوئے اور مقام قرقرہ پہونچے تو یہاں ان کو قبیلہ بنو عامر کے دو شخص ملے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پناہ دی تھی۔ حضرت عمرو بن امیہ کو اس کا علم نہیں تھا۔ عامر بن طفیل نے جو ستم ڈھایا تھا انھوں نے اس کے غصہ میں ان دونوں کو قتل کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو سخت افسوس کیا اور فرمایا: "میں ان دونوں مقتولین کا خون بہا ادا کروں گا"[1]

بنو نضیر اور بنو عامر دونوں ایک دوسرے کے حلیف تھے اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ مقتولین کی دیت کے بارہ میں گفتگو فرمانے کی غرض سے بنو نضیر کی آبادی میں تشریف لے گئے اور آنے کی غرض بیان کی، بنو نضیر نے بظاہر بڑی آؤ بھگت کی۔ آپ سے بولے: "تشریف رکھئے، کھانا تیار ہو رہا ہے اسے کھا کر جائیے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ ایک مکان کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اب بنو نضیر نے آپس میں کہا ایسا موقع کہاں ملتا ہے، اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے، ایک شخص اس پر رضامند ہو گیا کہ مذکورہ مکان کی چھت پر چڑھ کر نصیب دشمناں اوپر سے بھاری پتھر حضور پر پھینک دے گا، حضور نے

---

[1] الدرر ص ۱۷۲ و سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۱۹۷

ان لوگوں کا یہ عندیہ بھانپ لیا اور چپکے سے یہاں سے نکل کھڑے ہوئے، صحابہ نے کچھ دیر راہ دیکھی، جب آپ نہ آئے تو صحابہ بھی واپس ہو گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیت کے سلسلے میں بنو نضیر کے پاس جو تشریف لے گئے تھے تو کیوں؟ اس میں روایات مختلف ہیں اور ارباب سیر نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں۔ عام روایت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں اور بنو نضیر میں معاہدہ تھا کہ "مسلمانوں پر کسی کا خونبہا قسم کی کوئی چیز واجب ہو گی تو بنو نضیر اس کی ادائیگی میں مسلمانوں کے شریک ہوں گے اور علی ہذا القیاس اس کے برعکس بھی! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی معاہدہ کے ماتحت اس معاملہ میں بنو نضیر کے حصہ کا مطالبہ کرنے گئے تھے" (تاریخ العرب قبل الاسلام ج ۶ ص ۱۴۸) اور مولانا شبلی نے بھی اسی توجیہ کو اختیار کیا ہے، لیکن ایک دوسری توجیہ یہ ہے کہ چونکہ بنو عامر اور بنو نضیر آپس میں ایک دوسرے کے حلیف تھے اسی بنا پر خونبہا تو ادا کرنا تھا صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو، لیکن آپ بنو نضیر کے پاس اس معاملہ میں باہم مشورہ اور رائے کے لئے گئے تھے کہ قبیلہ بنو عامر کو دیت کس طرح ادا کی جائے اور ان کے یہاں اس کا کیا دستور ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرت حلبیہ کے حوالہ سے اس توجیہ کو نقل کیا ہے اور اپنا رجحان اسی کی طرف ظاہر ہے، (دیکھئے سیرت النبی حصہ اول حاشیہ ص ۴۰۹) اور ہمارا رجحان بھی اسی طرف ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کے مختلف قبائل سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں بھی بنو نضیر کا شریک ہونا مشتبہ ہے، چنانچہ ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ بنو نضیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ اپنے تیس آدمی لیکر آئیں، ہم بھی اپنے علماء (احبار) لے کر آئیں گے، اگر آپ کا کلام سن کر احبار نے اس کی تصدیق کی تو ہمیں بھی اس کے قبول کر لینے میں عذر نہ ہو گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی طرف سے غدر و خیانت کا اندیشہ پہلے سے تھا اس لئے آپ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ جب تک تم مجھ سے معاہدہ نہیں کرو گے میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا، لیکن بنو نضیر اس پر راضی نہیں ہوئے، یہاں تک کہ جب آپ یہود

بنی قریظہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے تجدید معاہدہ کی درخواست کی تو انھوں نے تعمیل کی، لیکن بنو نضیر کسی طرح معاہدہ کرنے پر رضامند نہیں ہوئے اور انجام کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام بھیجا کہ "اچھا! آپ تین آدمی ساتھ لے کر آئیں، ہم بھی تین عالم ساتھ لائیں گے، اگر یہ آپ پر ایمان لے آئے تو ہم بھی لے آئیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منظور فرمایا، لیکن راہ میں ایک صحیح ذریعہ سے معلوم ہوا کہ وہاں بنو نضیر تلواریں باندھے کھڑے ہیں کہ آپ وہاں پہونچیں تو اچانک حملہ کر کے ہلاک کر دیں۔ (سیرت النبی حصہٴ اول ص ۱۰۱ بحوالہٴ سنن ابی داوٴد و فتح الباری)

علاوہ ازیں اس روایت میں اس امر کا ذکر کہ "بنو عامر اور بنو نضیر میں عقد و حلف تھا" تقریباً ہر کتاب میں ہے اور ظاہر ہے بنو نضیر کا حلیف بنی عامر ہونا ہرگز اس بات کا موجب نہیں ہو سکتا کہ بنو نضیر سے بنی عامر کے دو مقتولین کے خونبہا کی ادائیگی میں حصہ دار بننے کا مطالبہ کیا جائے، اس بنا پر صحیح بات یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر کے پاس جو گئے تھے تو دیت کے بارہ میں مشورہ کرنے گئے تھے نہ کہ کسی چیز کا مطالبہ کرنے کی غرض سے۔

اس موقع پر دنیا کو یہ بات خاص طور سے نوٹ کر لینی چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اڑسٹھ (۶۸) نہایت غریب و مسکین ساتھی ناحق بہدردی و بے رحمی سے قتل کئے گئے ہیں، ان کا آپ کو نہایت شدید صدمہ اور غم ہے، لیکن اس کے باوجود اپنے قول و قرار کا اس درجہ پاس اور لحاظ ہے کہ بنو عامر کے دو خطاءً مقتولین کی دیت کو فوراً ادا کر دینے کا اہتمام فرما رہے ہیں، دل اور دماغ کا صحیح توازن اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے!

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

بہر حال اب مزید اغماض اور چشم پوشی کرنا ممکن نہ تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محمد بن مسلمہ کو بھیجکر ان کو مطلع کیا کہ ان کے متعلق جلاوطنی کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور ان کے لئے دس روز کی مدت مقرر کر دی گئی کہ اس کے اندر اندر وہ مدینہ سے رخصت ہونے کا

انتظام کرلیں۔ بنو نضیر کو اپنی طاقت و قوت کا گھمنڈ تھا، منافقین سے بھی ان کا ساز باز تھا اور بنو قریظہ تو ان کے ہم مذہب اور ہم مسلک تھے ہی، انھوں نے ان کو یقین دلایا تھا کہ وہ آخر وقت تک ان کا ساتھ دیں گے اور اگر ان کو مدینہ چھوڑنا ہی پڑا تو وہ بھی ان کے ساتھ مدینہ چھوڑ دیں گے۔ اس بنا پر بنو نضیر کے سردار حیی بن اخطب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہلا بھیجا کہ ہم اپنے گھروں سے باہر نہیں آئیں گے، آپ جو جی میں آئے کیجئے، قرآن مجید کی سورۂ حشر میں اس کا ذکر اس طرح ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ

اے محمد! آپ نے دیکھا! منافق اپنے بھائیوں سے جو اہل کتاب میں سے کفر کرنے والے ہیں کہتے ہیں: اگر (مدینہ سے) تم نکالے گئے تو ہم بھی تمھارے ساتھ نکلیں گے، اور ہم تمھارے معاملہ میں کسی ایک شخص کی بھی اطاعت کبھی قبول نہیں کریں گے، اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم یقیناً تمھاری مدد کریں گے۔

جب مدت معینہ یعنی دس روز اور بعض روایات کے مطابق پندرہ دن ختم ہو گئے تو بنو نضیر قلعہ بند ہو گئے اور اسلامی لشکر نے ان کا محاصرہ کرلیا، حافظ ابن عبدالبر کے بیان کے مطابق محاصرہ چھ دن رہا، نخلستان کا ایک حصہ جو بنو نضیر کے قلعہ اور اسلامی لشکر کے درمیان حائل ہوتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کاٹ دیا گیا، یہ بات بظاہر قابل اعتراض تھی چنانچہ خود بنو نضیر نے اس پر احتجاج کیا، اس بنا پر قرآن مجید میں اس کی صفائی میں فرمایا گیا:

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ

تم نے لینہ کے جو درخت کاٹے اور جن کو علی حالہا قائم رہنے دیا، یہ سب اللہ کی اجازت

لِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ ٥ (الحشر) سے تھا اور اس لئے تھا کہ اللہ تعالیٰ سرکشوں کو رسوا کرے

عرب میں بہترین کھجور عجوہ سمجھی جاتی ہے چنانچہ حضور کو بھی یہی پسند تھی۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ لینہ اس کھجور کو کہتے ہیں جو عجوہ کی ضد ہو، یعنی ردی قسم کی ہو، اس بنا پر اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ نخلستان کے سب درخت نہیں کاٹے گئے اور دوسرے یہ کہ جو درخت کاٹے بھی گئے تھے وہ اچھی قسم کی کھجوروں کے نہیں تھے۔

آخر کار بنو نضیر کو جب کہیں سے مدد نہ ملی اور خود ان میں مقابلہ کی طاقت نہ تھی تو وہ جلاوطنی پر راضی ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دی تھی کہ ہتیاروں کو مستثنیٰ کر کے وہ اپنا مال و متاع سب کچھ لے جا سکتے ہیں، چنانچہ بنو نضیر مدینہ سے اس طرح روانہ ہوئے کہ کسی ایک شخص کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی تھی۔ ان کے اونٹ ساز و سامان سے لدے ہوئے تھے۔ گھر کے دروازوں کے چوکھٹے تک ان کے ساتھ تھے، قافلہ میں مرد، عورتیں اور بچے سب ہی تھے، بنو نضیر میں اور انصار میں ازدواجی تعلقات تھے، اس بنا پر انصار کی اولاد میں سے بعض نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اس موقع پر بنو نضیر نے ان کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ انصار نے کو روکا۔ جب جھگڑا بڑھا تو قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:[1]

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرہ) مذہب میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔

بنو نضیر ترک وطن کر کے جا رہے تھے، لیکن ان کے تزک و احتشام پر جشن کا دھوکہ ہوتا تھا، ابن ہشام میں ہے کہ ان کے ساتھ دف اور آلات موسیقی بھی تھے اور قافلہ کے

---

[1] تفسیر ابن جوزی ج ۱ ص ۳۰۵، یہ قول حضرت عبداللہ بن عباس کا ہے اور یہ روایت ابو داؤد، نسائی اور سنن البیہقی سب میں ہے۔

پیچھے لڑکیاں گاتی بجاتی چل رہی تھیں، مدینہ سے نکل کر یہ دو حصوں میں بٹ گئے، کچھ شام چلے گئے اور بعض خیبر میں جا بسے، موخر الذکر گروہ میں رؤوسائے قبیلہ سلاّم بن ابی الحقیق، حی بن اخطب، کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق بھی شامل تھے۔ یہ لوگ جب خیبر پہونچے تو وہاں کی آبادی نے اِن کا اس درجہ ادب واحترام کیا کہ ان کو اپنا لیڈر تسلیم کرلیا اور ان کی اطاعت قبول کرلی۔ سیرت ابن ہشام میں ہے "دان اهله لهم" یہ لوگ آنحضرت اور اسلام کے شدید دشمن تھے، یہاں کس طرح چین سے بیٹھ سکتے تھے، انھوں نے ایک طرف بنو قریظہ سے اتصال پیدا کیا اور دوسری جانب قریش کو ابھارا اور اپنے وفد بھیجکر غطفان اور سُلیم قبائل کو مدینہ پر حملہ کے لئے برانگیختہ کیا اور ان کو طرح طرح کے لالچ دیے چنانچہ غزوۂ احزاب جس کا دوسرا نام جنگ خندق ہے (ذوالقعدہ ۵ھ) اور اس کے بعد غزوۂ خیبر (۷ھ) یہ دونوں انھیں لوگوں کی کوششوں اور جدوجہد کا نتیجہ تھے، طبری اور فتح الباری اور دوسری کتب سیرت ومغازی میں اس کی تصریح موجود ہے۔

قبیلہ بنو نضیر کی صحیح تعداد کیا تھی اس کا پتہ نہیں چلتا ہے لیکن اندازہ یہ ہے کہ ان کی تعداد بنو قینقاع سے کم تھی کیونکہ جو ہتھیار یہ چھوڑ کر گئے ہیں ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ اب رہی یہ بات یہ واقعہ کب ہوا تھا، امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں دونوں روایتیں نقل کی ہیں، غزوۂ احد سے پہلے کی اور اس کے بعد کی بھی لیکن اغلب یہی ہے کہ غزوۂ احد کے پانچ چھ مہینے کے بعد یہ واقعہ پیش آیا تھا چنانچہ کتب سیرت ومغازی سب میں یہی تاریخ مذکور ہے۔

عہد نبوی کے غزوات وسرایا
اور
ان کے مآخذ پر ایک نظر

(۱۶)

سعید احمد اکبر آبادی

بنو قریظہ

اب مدینہ کے مشہور اور بڑے قبائل میں سے صرف ایک قبیلہ بنو قریظہ کا رہ گیا تھا اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو سازشیں ہوئی تھیں بنو قریظہ ان سب میں اپنے ہم مذہبوں کے شریک وسہیم تھے لیکن چونکہ انھوں نے بنو نضیر کی جلاوطنی کے بعد بھی مدینہ میں قیام کرنا پسند کیا اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس سے زیادہ اور کیا رعایت اور رواداری ہوسکتی تھی کہ آپ نے ان کو مدینہ میں قیام کی اجازت دے دی البتہ معاہدہ کی تجدید ضروری تھی، چنانچہ وہ آپ نے کی، اور جیسا کہ گذر چکا ہے اس معاہدہ کی ایک اہم دفعہ یہی تھی کہ مدینہ پر دشمن حملہ آور ہوگا تو بنو قریظہ اس کی کوئی مدد نہیں کریں گے اور ایک پرامن شہری کی طرح رہیں گے، لیکن وہ اپنی فطرت سے کس طرح باز آسکتے تھے بلکہ جیسا کہ واقدی نے بنو نضیر کے سردار حیی بن اخطب کی زبانی نقل کیا ہے ان لوگوں نے معاہدہ کرکے مدینہ میں قیام کا فیصلہ کیا ہی اس غرض سے تھا کہ جب بھی ان کو موقع ملے گا وہ مسلمانوں کے دشمنوں سے

مگر انھیں نقصان پہونچانے کی کوشش کریں گے[1]۔ اس سلسلہ میں غزوۂ احزاب (خندق) کا ذکر ضروری ہے۔

غزوۂ احزاب اوپر گذر چکا ہے کہ بنو نضیر کے بڑے بڑے سرداروں نے قریش اور قبیلۂ غطفان اور سلیم (جو اسلام دشمنی میں قریش سے کم نہیں تھے) اور دوسرے قبیلوں میں اپنے وفد بھیجکر ان کو مدینہ پر حملہ آور ہونے کی سخت ترغیب دی اور انھیں فتح و نصرت کا یقین دلاکر بہت کچھ سبز باغ دکھائے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ دس ہزار کا لشکرِ جرار تیار ہو گیا، اس میں قریش اور ان کے ساتھ بنو کنانہ اور اہلِ تہامہ ان سب کی تعداد چار ہزار تھی باقی چھ ہزار کی تعداد غطفان اور ان کے ساتھ نجد کے جو قبائل تھے ان پر مشتمل تھی، ہر قبیلہ کا قائد لشکر (کمانڈر) الگ الگ تھا، چنانچہ ابوسفیان بن حرب قریش کا قائدِ لشکر تھا اور یہی کمانڈر ان چیف بھی تھا، غطفان عیینہ بن حصن الفزاری کی زیر قیادت تھا۔ بنو مرۃ: حارث بن عوف کے، قبیلۂ اشجع، مسعود بن رخیلہ کے بنو سلیم، سفیان بن عبد شمس کے اور بنو اسد، طلیحۃ بن خویلد الاسدی کے زیر قیادت تھے، ان کے ساز و سامان اور طنطنہ و طمطراق کا یہ عالم تھا کہ اس ٹڈی دل فوج میں چھ سو شہسوار (Cavalry) تھے جن میں سے تین سو تو صرف قریش کے تھے، باقی غطفان اور دوسرے قبیلوں کے تھے اور اونٹ ڈیڑھ ہزار تھے۔

دومۃ الجندل کی مہم یہ تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک نیا شگوفہ یہ کھلا کہ بنو نضیر جو جلا وطن ہو کر مدینہ کے شمالی علاقوں میں جا بسے تھے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ان یہودی نو آبادیوں میں بھی آگ لگا دی تھی جو شام کے راستہ پر فلسطین تک پھیلی ہوئی تھیں، دومۃ الجندل جو شام کی سرحد اور مدینہ سے پانچ سو میل دور کی مسافت پر واقع تھا اس کے باشندوں پر بھی ان لوگوں کے اثرات تھے، ابن سعد میں ہے کہ شام سے

---

[1] مغازی واقدی ص ۳۶۲ بحوالہ سیرت النبی ج ۱ ص ۴۴۳

جو قافلے مدینہ آتے تھے دومۃ الجندل کے لوگ ان کو ستاتے اور پریشان کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان واقعات کا علم ہوا تو آپ ان لوگوں کی سرزنش کی غرض سے ماہ ربیع الاول ۵ھ میں ایک ہزار صحابہ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ آپ کے ہاں جاسوسی کا انتظام تو بہت اعلیٰ تھا ہی، ابھی آدھے راستہ میں ہی تھے کہ آپ کو قریش وغطفان وغیرہما کے منصوبوں کا علم ہوا اور آپ دومۃ الجندل کا ارادہ ترک کرکے مدینہ واپس آگئے،

صحابہ سے مشورہ اور خندق کی کھدائی مدینہ پہونچکر آپ نے مشورہ کیا کہ اب جبکہ دشمن قبائل مدینہ پر اجتماعی حملہ کا منصوبہ بناکر اس کے لئے تیاریاں کر رہے ہیں مسلمانوں کو ان کے دفاع میں کیا کرنا چاہیئے، حضرت سلمان فارسی نے خندق کھودنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ اہل ایران اس قسم کے موقع پر ایسا ہی کرتے ہیں، اگرچہ عرب اس طریقہ جنگ سے بالکل ناآشنا تھے، لیکن حضور کو یہ تجویز پسند آئی [۱] اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چند انصار و مہاجرین کو ساتھ لے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے اور مدینہ کے اطراف میں گھوم پھر کر ان مقامات کا معائنہ فرمایا جو جنگ اور محاصرہ میں اہمیت رکھ سکتے تھے۔ اور اس مقام کی تلاش کی جہاں پڑاؤ ڈال کر مسلمان سپاہی اتر سکیں، آپ نے اس وقت یہ طے کیا کہ مدینہ پر حملہ ہوا تو عورتوں، بچوں، جانوروں اور قیمتی گھرگرہستی کے سامان کو ان گڑھیوں میں منتقل کیا جائیگا جو مدینہ کے اطراف میں کثرت سے پھیلی ہوئی ہیں اور جنھیں عربی میں آطام کہتے ہیں اور اسلامی لشکر کے کیمپ کے لئے آپ نے جو مقام منتخب فرمایا وہ سلع پہاڑی کا دامن تھا۔

---

[۱] مستشرقین سب اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس زمانہ کے اصول جنگ کے اعتبار سے یہ طریقہ اعلیٰ اور ترقی یافتہ طریقۂ جنگ تھا، غزوۂ احد کے موقع پر بھی آپ کی رائے قریب قریب یہی تھی، لیکن پرجوش اور نوجوان افسروں کے اصرار پر آپ نے مدینہ سے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کیا اور اس کا جو انجام ہوا سب کو معلوم ہے۔

مدینہ میں تین طرف باغوں اور نخلستانوں کا جال پھیلا ہوا تھا جو شہر کے لئے حصار کا کام دیتے تھے، البتہ شمالی رخ جسے شامی بھی کہہ سکتے ہیں کھلا ہوا تھا اور یہی سب سے خطرناک تھا، اگرچہ ایک حد تک مغربی رخ بھی ایسا ہی تھا۔ مشرق میں بنو قریظہ آباد تھے، ان سے بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی، بہرحال مدینہ کا جو رخ کھلا ہوا تھا یعنی شمالی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے مشورہ سے اسی رخ خندق کا کھودنا طے ہوگیا تو اب اس علاقے کی پیمائش کی گئی، مسلمان جو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جمع ہوگئے تھے ان کی تعداد تین ہزار تھی، ان پر کام کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ ہر دس آدمیوں کی ایک ٹکڑی کو بیس گز خندق کھودنے کا کام سپرد ہوا۔ اسی طرح ڈاکٹر حمید اللہ کے اندازہ کے مطابق یہ خندق تقریباً ساڑھے تین میل لانبی تھی خندق کی چوڑائی کا تذکرہ کسی کتاب میں نہیں ہے، لیکن اس کا ثبوت موجود ہے کہ دشمن کے سواروں نے متعدد بار گھوڑا کدا کر خندق کو پار کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے، اور ایک مرتبہ اسی قسم کی کوشش میں ایک سوار خندق کے اندر گر کے مرگیا۔ اس سے ڈاکٹر صاحب موصوف نے قیاس کیا ہے کہ خندق کی گہرائی تو دس گز تھی ہی اس کی چوڑائی بھی دس گز ہوگی [1] لیکن ہمارے خیال میں اگر قیاس کا معیار یہی ہے تو خندق کی چوڑائی دس گز سے یقیناً زیادہ ہونی چاہئے کیونکہ ایک اسپ تازی کے لئے دس گز پھلانگ جانا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

خندق کھودنے کا کام شروع ہوا تو صحابۂ کرام صبح سے ہی اس میں لگ جاتے اور بھوک پیاس کی پروا کئے بغیر شام تک اسے کرتے رہتے تھے اس درمیان میں اگر کسی کو کوئی ضرورت پیش آجاتی تو حضورؐ سے اجازت لے کر جاتا تھا۔ ایک مرتبہ حضور نے یہ منظر دیکھا کہ صحابہ فاقہ سے ہیں۔ سردی بلا کی پڑ رہی ہے، لیکن اس عالم میں بھی وہ تیشہ زنی میں معروف ہیں

---

[1] عہد نبوی کے میدان جنگ ص ۶۷

خندق کھود رہے اور مٹی اپنی کمر پر لاد لاد کر باہر پھینک رہے ہیں تو آپ کا جی بھر آیا اور زبان قدس گویا ہوئی۔ "اے اللہ! اصل زندگی تو آخرت کی ہی ہے، تو انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرمادے" جاں نثاروں نے یہ سنا تو بلند آواز سے بولے: ہم وہ ہیں جنھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتوں پر، جب تک ہم زندہ ہیں، جہاد کرنے کی بیعت کی ہے'
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ لشکر کے قائد اعظم تھے لیکن ایک مزدور کی طرح اس مہم میں برابر کے شریک تھے، صحیح بخاری میں ہے کہ حضور خندق کھودتے جاتے اور مٹی باہر پھینکتے جاتے تھے، یہاں تک کہ شکم مبارک گرد سے اٹ گیا۔ حضرت جابر سے روایت ہے کہ ہم لوگ خندق کھود رہے تھے کہ اچانک ایک سخت چٹان آگئی جو سر نہیں ہوتی تھی، حضورؐ کو اس کا علم ہوا تو خندق میں اتر کے اس زور سے پھاوڑا مارا کہ چٹان غبار بنکر اڑ گئی۔[1]

مدینہ پر حملہ

خندق کتنے دنوں میں تکمیل کو پہونچی؟ اس میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک چھ دنوں میں، بعض کی رائے میں چند روز، اور ایک خیال یہ بھی ہے کہ چوبیس روز میں بنکر تیار ہوئی، بہرحال خندق سے فراغت ہوئی ہی تھی کہ دشمن کی فوج آپہونچی اور اس نے مدینہ کا محاصرہ اس طرح کیا کہ قریش، بنی کنانہ اور ان کے احابیش[2] نے سب مقام جرف اور زغابہ کے درمیان رومہ پر اور غطفان اور ان کے ساتھی قبائل جبل احد کی سمت

---

[1] صحیح بخاری باب غزوۃ الخندق

[2] یہ لوگ سخت سیاہ فام اور افریقی الاصل تھے ان لوگوں کو قریش کے امراء و رؤسا کی کاشتکاری کے لئے لا یا گیا تھا۔ بعد میں ان کے متعدد قبیلے بن گئے۔ چنانچہ خزاعہ کے بنی المصطلق، الھون بن خزیمہ، اور ان کی شاخیں عضل اور القارہ یہ سب احابیش میں شمار ہوتے تھے، ان کا سب سے بڑا قبیلہ الحارث بن عبد مناف بن کنانہ تھا۔

(عمران مدینہ ص ۸۱)

ذنب نقمی نامی مقام پر فروکش ہو گئے، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اپنی پوزیشن سنبھال لی، تین ہزار فدا کاروں کے ساتھ جبل سلع کی طرف پشت کر کے اپنے کیمپ قائم کر لئے[1] مستورات کو مدینہ کے ارد گرد جو گڑھیاں تھیں ان میں منتقل کر دیا۔ حضرت عائشہ اور ان کے ساتھ چند خواتین کو بنی حارثہ کے گڑھی میں رکھا گیا، علاوہ ازیں آپ نے دوسرے انتظامات یہ کئے کہ مدینہ کی اندرونی حفاظت اور اس کی نگرانی کا انچارج حضرت ابن مکتوم کو بنایا۔ اور چونکہ مشرق میں بنو قریظہ کی طرف سے اندیشہ تھا اس لئے حضرت سلمۃ بن اسلم کو دو سو آدمیوں کے ساتھ متعین کیا کہ اس طرف کا دھیان رکھیں کہ حملہ نہ ہونے پائے، حضور کا معمول تھا کہ جنگ میں اپنا کیمپ ذرا بلند اور محفوظ مقام پر لشکر سے الگ رکھتے تھے تاکہ دشمن کی نقل و حرکت اور اسلامی لشکر کی حالت پر نظر رکھ سکیں، چنانچہ یہاں بھی آپ نے یہی کیا۔ جبل سلع کی پشت پر لشکر اسلام نے خیمہ الگن ہو کر اپنے مورچے سنبھال لئے تو اب حضور خود اپنا کیمپ جبل سلع کے اوپر ایک محفوظ مقام پر لے گئے، اسی کے قریب آپ کے چار سپہ سالاروں یعنی حضرت سلمان فارسی، حضرت ابوبکر، حضرت عثمان اور حضرت ابوذر غفاری کے خیمے تھے بعد میں ان پانچوں خیموں کی یادگار میں مسجدیں بنا دی گئی تھیں جو "ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں" اب تک مساجد خمسہ کے نام سے مشہور ہیں اور پائی جاتی ہیں (ص ۳۷)

اب دونوں لشکر آمنے سامنے تھے، ادھر دس ہزار کا لشکر جرار اور اس طرف صرف تین ہزار کی جمعیت، اور اس میں بھی جو منافقین آ ملے تھے وہ بہانہ بہانہ سے بھاگنے کی کوشش کرتے تھے، قرآن مجید کی سورۂ احزاب

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۲۳۱

میں اس کا ذکر ہے ارشاد ہوا :

یقولون ان بیوتنا عورۃ وما ھی
بعورۃ ، ان یریدون الا فرارا ۵

منافقین کہتے ہیں ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں
حالانکہ وہ ایسے نہیں ہیں ، اصل بات
یہ ہے کہ یہ بھاگ جانا چاہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت مسلمانوں کے لئے انتہائی خطرناک ، نازک اور تشویش انگیز تھا ، قرآن مجید میں اس کی تصویر کشی اس طرح کی گئی ہے :

اذ جاءوکم من فوقکم ومن
اسفل منکم واذ زاغت
الابصار وبلغت القلوب
الحناجر وتظنون باللہ
الظنونا ھنالک ابتلی المومنون
وزلزلوا زلزالاً شدیداً ۵
(سورۂ احزاب)

اور اے مسلمانو ! تم یاد کرو اس وقت
کو جبکہ تمہارے دشمن (غطفان اور
اور ان کے ساتھی قبائل) اوپر سے
(یعنی بجانب مشرق وادی کے اوپر
سے) اور قریش اور ان کے ساتھی
قبائل بجانب مغرب) نیچے بطن وادی
سے آپہونچے تھے اور اس وقت تمہاری
نگاہیں خیرہ ہوگئی تھیں اور کلیجے منہ کو
آگئے تھے اور تم اللہ کے بارہ میں طرح طرح
کے خیالات کرنے لگے تھے ، یہ وہ وقت
تھا جب کہ مسلمانوں کو آزمائش میں
ڈال دیا گیا اور انھیں سخت جھنجوڑ دیا
گیا تھا۔

اس وقت صرف ایک خندق تھی جو دونوں کے درمیان حائل تھی ، ایک مرتبہ ابوسفیان گھوڑے پر سوار اپنی فوج کا جائزہ لیتے ہوئے ادھر آنکلا تو

خندق دیکھکر ٹھٹک کے رہ گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے بولا: اخاہ! اب مقابلہ پر کیوں نہیں آتے، یہ خندق کا طریقہ کس سے سیکھا ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا: "یہ طریقہ میرے خدا نے مجکو بتا یا ہے"[۱] دشمن اِدھر اُدھر سے کہیں سے خندق پار کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ ایک تو خندق کی چوڑائی اور گہرائی اس سے مانع تھی اور پھر جو ادھر کا رخ کرتا تھا مسلمان قدر اندازوں کے تیراسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

اسی کشمکش میں ایک مرتبہ عرب کے چند نامی گرامی شہسواروں کا ایک دستہ جس میں عمرو بن عبدودّ العامری، عکرمۃ بن ابی جہلؓ، ہبیرۃ بن ابی وہب اور ضرار بن الخطاب الفہری ایسے نامور ان قریش شامل تھے، ایک کسی قدر تنگ مقام سے خندق کو پار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس مقام پر حضرت علی تعینات تھے، انھوں نے یہ دیکھا تو چند ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھکر شہسواروں کو چیلنج کیا۔ عمرو بن عبد وُدّ اس دستہ کا سردار تھا، اس نے غزوۂ بدر میں ایک زخم کاری کھایا تھا اور اسی وقت سے انتقام کی فکر میں تھا۔ حضرت علی نے اس سے کہا کہ دو باتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرے، یا اسلام قبول کر یا مجھ سے نبرد آزما ہو، ابن عبد وُدّ نے جواب دیا: میں نہ اسلام قبول کر سکتا ہوں اور نہ تم سے جنگ کرنا مجھے پسند ہے، کیونکہ

---

[۱] ابن ہشام،

تمھارے والد سے میری صاحب سلامت تھی، اس رشتہ سے تم میرے بھتیجے ہوتے ہو، حضرت علی تڑپ کے بولے : "مگر میں تو تم سے جنگ کرنا چاہتا ہوں" یہ فقرہ سمند ناز پر ایک تازیانہ تھا۔ ابن عبدوُد طیش میں آکر گھوڑے پر سے اتر آیا اور تلوار نیام سے نکال کر حضرت علی پر حملہ آور ہوا۔ حضرت علی نے وار روکا اور جھپٹ کر اس پر حملہ کیا مگر ابن عبدوُد پہلو بچا گیا، راوی کا بیان ہے کہ دونوں میں اسی طرح جنگ ہوتی رہی، یہاں تک کہ غبار بلند ہوا اور اندھیرا چھا گیا۔ دیکھنے والوں کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا کہ کیا ہورہا ہے ! حافظ ابن عبدالبر کے الفاظ ہیں : "فتنازلا و تجادلا وثار النقع بینھما حتیٰ حال دونھما" آخر جب غبار چھٹا تو لوگوں نے دیکھا کہ حضرت علی ابن عبدوُد کے سینہ پر سوار ہیں اور اس کا سر قلم کر رہے ہیں۔ ابن عبدوُد کے ہمراہیوں نے یہ منظر دیکھا تو ان پر ایسا سہم چڑھا کہ جس راستے سے آئے تھے اسی سے گھوڑے اڑا کر واپس ہوگئے۔[1]

اس موقع پر کتب سیرت میں حضرت علی کے تین یا چار اشعار نقل کئے گئے ہیں جو آپ نے عمرو ابنِ عبدوُد کے قتل ہونے پر ازراہ فخر پڑھے، لیکن خود ابن ہشام نے ان کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اہل علم کے نزدیک ان اشعار کی نسبت حضرت علی کی طرف صحیح نہیں ہے۔[2]

---

[1] الدرر ص ۱۸۵

[2] جلد ۳ ص ۲۳۲

بنو قریظہ کی استمالت قبائل نے دیکھا کہ محاصرہ طویل ہوتا جاتا ہے اور خندق کو پار کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو اب انھوں نے بنو قریظہ کو اکسایا اور ورغلایا کہ وہ پیچھے سے یعنی مشرق کی طرف سے حملہ کر دیں، چنانچہ ابو سفیان نے عکرمہ بن ابی جہل کو قریش اور غطفان کے چند لوگوں کے ساتھ بنو قریظہ کے پاس بھیجا اور ان کو یہ پیغام دیا کہ اب ہمارے اونٹ اور گھوڑے ہلاک ہونا شروع ہو گئے ہیں، ہم زیادہ دنوں تک یہاں قیام نہیں کر سکتے تم لوگ کل صبح جنگ کے لئے آجاؤ تاکہ ہم سب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اچانک دھاوا بول دیں[1] لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے ہی نگرانی کے لئے دو سو آدمیوں کا دستہ ان لوگوں کے رخ پر متعین کر رکھا تھا اس لئے بنو قریظہ کو ابو سفیان کے پیغام پر عمل کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

---

[1] الاسلام ص ۱۸۷

عہدِ نبوی کے غزوات و سرایا
اور
اُن کے مآخذ پر ایک نظر

(۱۷)

(سعید احمد اکبر آبادی)

سلسلہ کے لئے دیکھئے اشاعت جنوری ۱۹۶۶ء

حی بن اخطب النضیری جو بنو نضیر کے اُن چند لیڈروں میں سے ایک تھا جنھوں نے غزوۂ احزاب کا فتنۂ عظیم برپا کیا تھا خود بنی قریظہ کے پاس گیا اور اُن کے سردار کعب بن اسد القرظی سے ملاقات کے لئے اُس کے قلعہ میں داخل ہونا چاہا تو اُس نے قلعہ کا دروازہ بند کر لیا، حی بن اخطب نے دروازہ کھولنے کی درخواست کی تو کعب نے کہا: میں تمھارے لئے دروازہ نہیں کھولوں گا۔ تم منحوس آدمی ہو، تم مجھ کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت پر اکساتے ہو، حالانکہ میں نے اُن سے عہد و پیمان کر رکھا ہے، اور میں نے محمد کو اپنے عہد و پیمان کو بڑا پابند اور سچا پایا ہے۔ اس لئے میں بھی اُس عہد کو نہیں توڑوں گا جو میرے اور اُن کے درمیان ہے" حی بن اخطب بولا: اچھا! دروازہ تو کھولو، میں تم سے بات کروں گا اور لوٹ جاؤں گا" کعب نے اب بھی دروازہ نہیں کھولا تو حی بن اخطب نے کعب کی عربی حمیت کو مہمیز کرنے کی غرض سے ایک ایسی بات کہی جس کے بعد دروازہ

کھول دینا یقینی تھا، اس نے کہا:
میں سمجھا! تم دروازہ اس لئے نہیں کھولتے کہ تمہیں ڈر ہے میں تمہارے طعام خاص[1]
میں حی بن اخطب کی یہ تدبیر کارگر ہوئی کعب نے غضبناک ہو کر فوراً دروازہ کھول دیا،
اب حی نے کہا: میں قریش اور غطفان کے سرداروں کی ایک فوج گراں لے کر آیا ہوں
جس نے محمد اور اُن کے ساتھیوں کو ختم کر دینے کی قسم کھالی ہے یہ کعب نے جواب دیا:
تم مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو، میں تمہاری بات ہرگز نہیں مان سکتا، تم جسے فوجِ گراں
کہتے ہو میرے نزدیک وہ چھوٹے بادل ہیں جو گھن گرج تو بہت دکھاتے ہیں مگر برستے
نہیں،، حی اور کعب میں دیر تک اسی طرح ردّوقدح اور تکرار ہوتی رہی، اس سلسلہ میں حی نے
یہ بھی کہا: اگر قریش ناکام واپس ہوتے بھی تو میں بہرحال یہیں مدینہ میں تم لوگوں کے ساتھ رہوں گا
پھر تمہیں کیا غم ہے،، آخر کعب پسیجا اور اُس نے حی کی ہمنوائی اختیار کر لی[2]

بنی قیقلے سے باہر/ بنو قریظہ نے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پُرامن رہنے کا معاہدہ کر رکھا
تھا لیکن جیسا کہ گذر چکا ہے وہ کبھی اس کے پابند نہیں رہے اور انھوں نے مسلمانوں پر
حملہ کے لئے کسی مناسب وقت کے انتظار میں اس کو دفع الوقتی کا محض ایک بہانہ بنایا
تھا، ورنہ جب کبھی ذرا موقع ملتا یہ اپنی شرارت سے باز نہیں آتے تھے، چنانچہ غزوہ خندق
کے لئے تیاری کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو بنو قریظہ کے قریب
ایک محفوظ قلعہ میں فروکش کر دیا تھا تو بنو قریظہ اُس وقت بھی نہ چوکے۔ انھوں نے خواتین
پر حملہ کا ارادہ کیا اور ایک یہودی کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ وہ حرم نشینانِ کاشانۂ نبوت کے
جائے قیام اور اُن کے حفاظتی انتظامات کا سراغ لگائے، یہ شخص مشتبہ انداز میں ادھر

---

[1] روایت میں جشیشہ کا لفظ آتا ہے، یہ عرب کا خاص اور لذیذ کھانا تھا جو موٹے پسے ہوئے گیہوں گوشت اور کھجور سے تیار کیا جاتا تھا۔

[2] ایضاً ج ۳ ص ۱۸۳

اُدھر گھوم رہا تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی حضرت صفیہ نے بھانپ لیا، انھوں نے حضرت حسان بن ثابت کو جو قلعہ کی پہرہ داری پر متعین تھے، اس طرف متوجہ کیا۔ مگر وہ ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے، انھوں نے اس پر دھیان نہیں دیا، آخر حضرت صفیہ نے خود ہمت کی اور قلعہ سے باہر نکل ایک چوب گراں سے یہودی کے ضرب کاری لگائی جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا، اس موقع پر حضرت صفیہ کے جو الفاظ ہیں وہ یاد رکھنے کے قابل ہیں، فرماتی ہیں :۔

بنو قریظہ اس وقت برسرِ جنگ تھے اور جو معاہدہ اُن کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان	وقد حاربت بنو قریظۃ، وقطعت ما بینھا وبین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

تھا وہ انھوں نے منقطع کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں، حی بن اخطب کا کعب بن اسد القرظی کو شیشہ میں اُتار لینا اور مدینہ سے جلا وطن ہونے کے باوجود خود اس کا بنو قریظہ میں رہ پڑنا! ان سب کے کیا معنی تھے؟ چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو تحقیق حال کے لئے چار آدمیوں کا ایک دستہ بھیجا جس میں خزرج کے سردار سعد بن عبادہ اور اُس قبیلہ کے لیڈر سعد بن معاذ بھی شامل تھے، دستہ کی روانگی کے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہدایت کر دی تھی کہ جو کچھ ہم نے سنا ہے اگر یہ سچ ثابت ہو تو تم واپس آکر ہم کو اُس کی اطلاع گول مول لفظوں میں دینا تاکہ مسلمانوں میں اُس سے عام اضطراب اور بے چینی نہ پیدا ہو البتہ ہاں اگر یہ خبر جھوٹی ہو تو تم اس کی خبر علانیہ دینا اب یہ دستہ وہاں پہنچا اور اُس نے تحقیق حال کی تو جو کچھ سنا تھا حالت اُس سے بھی بدتر پائی بنو قریظہ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نہایت گستاخانہ الفاظ کہے[1] اور انھوں نے صاف صاف کہا کہ ہمارا محمد سے کوئی کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہے"!

جس طرح بنو قینقاع خزرج کے حلیف تھے اسی طرح بنو قریظہ اُن کے حلیف تھے

[1] سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۲۳۹

اس بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے از راہ دور اندیشی و حکمت عملی اس دستہ میں سعد بن معاذ کو جو اُس قبیلہ کے سردار تھے شامل کیا تھا تاکہ یہ جو رپورٹ کریں گے اُس کے درست ہونے میں کسی کو تردد ہی نہ ہو اور بنو قریظہ کو بھی اُس کی تکذیب کا یارا نہ ہو، سعد بن معاذ اگرچہ بنو قریظہ کے حلیف تھے، لیکن اس وقت انھوں نے ان بدبختوں کی زبان سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں جو سخت گستاخانہ کلمات سنے تو برداشت نہ کر سکے اور پلٹ کر انھوں نے بھی جواب ترکی بترکی نہایت سختی اور درشتی سے دیا، جب بات زیادہ بڑھی تو سعد بن عبادۃ نے کہا: سعد بن معاذ! ان کو چھوڑو بھی! کیوں کہ ہمارے اور اُن کے درمیان جو معاملہ ہے وہ تو سب وشتم سے بھی کہیں زیادہ سخت ہے"، سعد بن نے واپس ہو کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق یہ خبر ڈھکے چھپے الفاظ میں سنائی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے از راہِ دل داری و دل جوئی فرمایا: لو! اے مسلمانو! تمھارے لئے خوش خبری ہے[1]" یہ حضور کی قیادت کا کمال ہے کہ خبر کس درجہ منحوس اور تشویش انگیز آئی ہے لیکن مسلمانوں کے سامنے آپ اس کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں تاکہ اُن میں بے چینی اور اضطراب نہ پیدا ہو۔

غرض کہ اس میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا کہ بنو قریظہ حسب سابق اب بھی اسلام اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید دشمن تھے، آپ سے ان کا جو معاہدہ ہوا تھا اس کو قولاً و عملاً انھوں نے توڑ دیا تھا، مقتول کے خون بہا کے معاملہ میں ان کو بنو نضیر کے ہم مرتبہ قرار دے کر آپ نے اُن پر جو احسانِ عظیم کیا تھا اُس کو اُن لوگوں نے پس پشت ڈال دیا تھا، آپ نے معاہدہ کی رو سے ان کو جان و مال کی امان اور مذہب وکسبِ معاش کی جو آزادی مرحمت فرمائی تھی اس کی ان لوگوں نے ذرا قدر نہیں کی اور ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے سینہ میں چھرا بھونک دینے کا جتن کرتے رہے۔

---

[1] (الدرر ص ۱۸۳)

غزوۂ احزاب سے بڑھ کر مسلمانوں کے لئے نازک اور تشویش انگیز وقت اور کون سا ہو سکتا تھا جب کہ دس ہزار کے ٹڈی دل نے مدینہ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا تھا اور مسلمان خندق کی ڈھال پر ان کو آگے بڑھنے سے روکے ہوتے تھے، ظاہر ہے اس وقت بنو قریظہ کس طرح چوک سکتے تھے، چنانچہ وہ کون سی شیطنت ہے جو انھوں نے نہیں کی، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ جنگی قیادت کو داد دینا چاہئے کہ آپ بنو قریظہ کی ایک ایک حرکت سے واقف رہے لیکن جنوب میں دوسرا محاذِ جنگ نہیں کھلنے دیا، بنو قریظہ ہزار کسمسائے اور بار بار بل کھاتے رہے لیکن حضور نے ان کی طرف حضرت علی کی سرکردگی میں دو سو آدمیوں کا جو دستہ متعین کر رکھا تھا اُس کی وجہ سے انھیں کھلم کھلا جنگ کرنے اور قریش و غطفان کو کمک پہنچانے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ قرآنِ مجید میں ان کے اس حال کی عکاسی اس طرح کی گئی ہے۔

وَأَنزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُم مِّنْ	اور وہ اہل کتاب (بنو قریظہ) جنھوں نے مشرکین
أَهْلِ الْكِتَابِ مِن صَيَاصِيهِمْ	کی مدد کی اللہ نے اُن کو اُن کے قلعوں سے نیچے
وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ	اُتارا اور اُن کے دلوں میں (مسلمانوں کا)
(الاحزاب)	رعب بٹھا دیا۔

مولانا شبلی نے لکھا ہے: قریظہ نے علانیہ جنگ میں شرکت کی اور شکست کھا کر ہٹ آئے۔" (سیرت النبی ج ۱ ص ۴۴۳) لیکن ماخذ کی عام روایات سے کھلم کھلا جنگ کرنے کا ثبوت نہیں ملتا، کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تحقیق حال کے لئے حضرت سعد بن معاذ، اور حضرت سعد بن عبادہ کو بھیجنے کی ضرورت کیا تھی؟ اور پھر ان دونوں حضرات نے حضور کو جو رپورٹ دی اُس میں کہیں علانیہ شرکت جنگ کا تذکرہ نہیں ہے۔

علاوہ ازیں حضرت علی اپنے دستہ (Regiment) کے ساتھ وہیں کہیں موجود

تھا اگر یہ لوگ میدان میں آکر مقابلہ کرتے تو حیدر کرار کی زد سے بچ کر کہاں جا سکتے تھے، تاریخ میں کہیں تو اس کا تذکرہ ہوتا۔

ایک عام روایت اور اُس کی تردید | اس سلسلہ میں ایک عام روایت جو تاریخ و سیر کی تمام کتابوں میں یہاں تک کہ حافظ ابن عبدالبر کے ہاں بھی موجود ہے، وہ یہ ہے کہ جن دنوں میں قریش اور بنو قریظہ میں بات چیت چل رہی تھی، نعیم بن مسعود اشجعی نام کے ایک غطفانی سردار نئے نئے مسلمان ہوئے تھے انھوں نے حضور کو یہ پیش کش کی کہ وہ قریش اور بنو قریظہ دونوں کے پاس جاکر لگائی بجھائی کی ایسی بات کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے دونوں کو ایک دوسرے کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہو جائے اور اُن میں باہم سنگھٹن نہ ہو سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو ایسا کرنے کی اجازت دے دی تو اب یہ بنو قریظہ کے پاس آئے اور کہا: قریش کا کیا اعتبار ہے، آج وہ یہاں ہیں، کل چلے جائیں گے، اس لئے تم قریش سے مطالبہ کرو کہ وہ اپنے کچھ آدمی تمھارے پاس بطور رہن کے رکھ دیں، دوسری طرف قریش سے جاکر کہا: بنو قریظہ کو تم پر بالکل اعتماد نہیں ہے، اس بنا پر وہ تم سے رہن کا مطالبہ کریں گے،" نعیم بن مسعود کا یہ حربہ کارگر ہوا، چنانچہ بنو قریظہ کی طرف سے جب ضمانت یا رہن کا مطالبہ ہوا تو قریش اُن سے مایوس ہو گئے اور دونوں میں گٹھ جوڑ نہ ہو سکا۔

مولانا شبلی نے بر بنائے قیاس اس روایت کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے لیکن مولانا سید سلیمان ندوی نے حاشیہ میں اس قیاس کی تصویب کرتے ہوئے مصنف ابن ابی شیبہ اور البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر کے حوالہ سے اس روایت کے بالمقابل ایک اور روایت پیش کی ہے جس سے روایت متعلقہ کی تردید ہو جاتی ہے اور ہمارے نزدیک حق یہی ہے، (دیکھئے سیرت النبی ج ۱ ص ۴۳۰ و ۴۳۱) جب ایک مستند روایت موجود ہے تو اس کی کیا ضرورت ہے کہ ابن اسحق کی روایت پر بھروسہ کیا جائے جس میں الحرب خدعۃ کی آڑ میں ایک صحابی کی نسبت ایسی بات بیان کی گئی ہو جو اُن کی شان کے مناسب نہ ہو۔

بہر حال اس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کی نسبت یہ طے کرلیا کہ اب اُن سے درگذر کرنا سانپ کو دودھ پلانے کے ہم معنی ہوگا اور اُن کا قطعی فیصلہ کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے، آپ کو انتظار صرف اسی بات کا تھا کہ غزوۂ احزاب ختم ہو تو آپ اس طرف متوجہ ہوں۔ اور قدرت نے اس کا سامان کر دیا۔

قبائل کی ناکام واپسی | محاصرہ جس قدر طویل ہوتا جاتا تھا قریش اور غطفان کے حوصلے پست ہوتے جاتے تھے، کیوں کہ خندق عبور کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی جو اُدھر کا رُخ کرتا مسلمان قدر اندازوں کے ہاتھوں منہ کی کھاتا تھا، سامانِ رسد کم ہوتا جارہا تھا، مزید سپلائی کی امید نہ تھی، یہود کی شرکت سے مایوسی اور نا امیدی تھی، یہ سب کچھ تو تھا ہی کہ اچانک موسم بہت شدید ہوگیا، سردی غیر معمولی طور پر سخت تھی، آندھی بھی چلنے لگی، جس کے باعث اُن کے خیمے اُڑ گئے اور ہانڈیاں اُلٹ پلٹ ہوگئیں، گھوڑے تتر بتر ہوگئے اور ایک عجیب افراتفری کا عالم پیدا ہوگیا، ابوسفیان ایک مرد جہاندیدہ و تجربہ کار تھا، یہ صورتِ حال دیکھ کر فوراً سمجھ گیا کہ اب مزید توقف کرنا مرگ عام کو دعوت دینا ہے، اُس نے قریش کو خطاب کر کے کہا: لوگو! اب یہاں ٹھہرنا سخت نقصان کا باعث ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ روانہ ہو جاؤ اُس نے یہ کہا اور جھٹ اپنے اونٹ پر سوار ہو چل دیا، ساتھ ہی قریش اور غطفان روانہ ہوگئے، اس طرح مدینہ کا مطلع جو کم و بیش تین ہفتوں سے غبار آلود تھا یکایک صاف ہوگیا[1]۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۚ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۚ
(احزاب)

اور اللہ نے کافروں کو غصہ میں بھرا ہوا واپس اس حالت میں لوٹا دیا کہ اُن کے ہاتھ کچھ نہ آیا اور اللہ نے مسلمانوں کو جنگ سے بچا لیا۔

---

[1] الاسرار ص ۱۸۸

قبائل کی ناکامی کے اسباب | دس ہزار کے ٹڈی دل فوج کا اس طرح ناکام ونامراد واپس ہوجانا دنیا کی تاریخ جنگ کا عجیب وغریب اور بڑا حیرت انگیز واقعہ ہے، پروفیسر مونٹگومری واٹ لکھتے ہیں: جنگی نقطۂ نظر سے قبائل کی ناکامیابی کا سبب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی غیر معمولی جنگی تدبیر، اُن کا اعلیٰ درجہ کا جاسوسی اور خبر رسانی کا محکمہ اور مسلمانوں کی اعلیٰ تنظیم ہے، قریش کو اپنی سوار فوج کی وجہ سے کامیابی کا یقین تھا، وہ جانتے تھے کہ اسلامی فوج اس سے عہدہ برآنہ ہوسکے گی، لیکن ایک خندق کے حربہ نے اُن کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا اور اُن کے چھ سو گھوڑے ذرا اُن کے کام نہ آئے، علاوہ ازیں اہلِ مکہ کو ایک عظیم نقصان اس سے پہنچا کہ جب انھوں نے مدینہ پر چڑھائی کی ہے اُس سے ایک ماہ قبل ہی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ازراہِ دوراندیشی تمام فصلیں کٹوا لی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت تمام کھیت صاف تھے اور گھوڑوں کے لئے چارہ نہ تھا۔

پروفیسر موصوف اس کے بعد لکھتے ہیں:

اس خالص فوجی اور جنگی نقطۂ نظر کے علاوہ غزوۂ احزاب کا جو نتیجہ ہوا اُس کا ایک بڑا سبب مسلمانوں کا اتفاق واتحاد اور اُن کا ڈسپلن اور نظم ونسق بھی تھا، پھر اس بات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بنو قریظہ کو شرکتِ جنگ سے الگ رکھ کر جس طرح جنوب میں ایک دوسرا محاذِ جنگ نہیں کھلنے دیا وہ اُن کے اعلیٰ سیاسی تدبر کی دلیل ہے[1]

بنو قریظہ کا محاصرہ | آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بروز چہارشنبہ ۲۳ ذیقعدہ ۵ھ غزوۂ احزاب سے واپس لوٹے اور چونکہ حی بن اخطب بنو قریظہ میں مقیم تھا اور وہ ایک عظیم فتنہ کا باعث ہوسکتا تھا اس بنا پر آپ فوراً بنو قریظہ کی طرف متوجہ ہوگئے، ابھی عصر کی نماز بھی ادا نہیں ہوئی تھی کہ آپ مجاہدین کی ایک جمعیت لے کر روانہ ہو لئے

(۱) Mohammad in Madina P: 37 - 39

علمبرداری کا شرف حضرت علی کو عطا فرمایا گیا، اور مدینہ کی حفاظت اور نگرانی عبداللہ بن مکتوم کے سپرد ہوئی حضرت علی اور اُن کے ساتھیوں کا بنو قریظہ سے آمنا سامنا ہوا تو اُن لوگوں نے حضور کی شان میں سخت گستاخانہ الفاظ کہے، اتنے میں حضور بھی پہنچ گئے، آپ نے بنو قریظہ کو خطاب کرکے فرمایا، بدبختو! تم نے معاہدہ توڑ دیا ہے، خدا تم کو اس کی سزا دے گا۔ اب آپ نے حکم دیا کہ بنو قریظہ کا محاصرہ کرلیا جائے، کم وبیش تین ہفتے محاصرہ جاری رہا۔

بنو قریظہ کا خاتمہ: بنو قریظہ چاہتے تھے کہ قلعہ میں رہتے ہوئے حضور سے کوئی معاملہ طے کریں لیکن آپ کو اصرار تھا کہ پہلے وہ قلعہ سے نکل کر اپنے آپ کو حضور کے سپرد کردیں، پھر جو معاملہ مناسب ہوگا۔ وہ اُن کے ساتھ کیا جائے گا۔ چنانچہ مجبور ہو کر یہ لوگ قلعہ سے اتر آئے، اب اُن کے ساتھ معاملہ کیا ہو؟ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بنو قریظہ کی خواہش کے مطابق حضرت سعد بن معاذ کو حَکَم مقرر کردیا کہ وہ جو فیصلہ چاہیں کریں، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، حضرت سعد بن معاذ قبیلۂ اُوس سے تعلق رکھتے تھے اور یہ قبیلہ بنو قریظہ کا حلیف تھا، اس بنا پر بنو قریظہ حضرت سعد بن معاذ کے حکم بننے سے مسرور بھی تھے اور مطمئن بھی، بنو قریظہ پر حجت تمام کرنے کی غرض سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید یہ تجویز بھی کی کہ سعد بن معاذ کا جو فیصلہ ہو وہ توراۃ کے احکام کی روشنی میں ہو، حضرت سعد بن معاذ نے فیصلہ کیا کہ "بنو قریظہ میں جو بالغ مرد ہیں اُن کو قتل کردیا جائے، عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے اور اُن کا مال ومتاع تقسیم کردیا جائے"، چوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر کے جلا وطن کرنے اور اس طرح اُن کو زندہ چھوڑ دینے کا انجام دیکھ چکے تھے اس بنا پر قرآن کے حکم اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ کے مطابق آپ کا ذاتی رجحان بھی ان لوگوں کا قصہ ہی پاک کردینے کی طرف تھا اور اس کے علاوہ کوئی اور صورت ممکن ہی نہ تھی، چنانچہ سعد بن معاذ نے جو فیصلہ دیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس

کی تصویب کی اور فرمایا: خدا کا فیصلہ بھی یہی ہے۔

اس فیصلہ کے مطابق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مدینہ کے بازار کی جانب خندقیں کھودی گئیں اور وہاں لے جاکر بالغ مردوں کا سر قلم کر دیا گیا، حی بن اخطب اور کعب بن اسد بھی ان مقتولین میں شامل تھے، حی بن اخطب کو جب مقتل میں لایا گیا تو اس نے حضور کی طرف دیکھا اور بولا: بخدا! مجھ کو اس کا افسوس نہیں ہے کہ میں نے تیرے ساتھ دشمنی کیوں کی، لیکن ہاں بات یہ ہے کہ خدا جس کو رسوا کرتا ہے وہ رسوا ہو ہی جاتا ہے، اس کے بعد وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور بولا:-

ایھا الناس! لاباس بامر اللّٰہ	اے لوگو! امر خداوندی کی تعمیل میں کوئی حرج
کتابٌ وقدرٌ وملحمۃ کتبھا اللّٰہ	نہیں ہے، یہی نوشتۂ تقدیر اور حکم الٰہی تھا اور
علی بنی اسرائیل [۱]	یہ ایک پاداش عمل تھی جو اللہ نے بنو اسرائیل
	کے مقدر کی تھی۔

مقتولین میں ایک عورت بھی تھی، جس کا نام بُنانہ تھا اور الحکم القرظی (بعض کتابوں میں الحسن القرظی) کی بیوی تھی، اس کا جُرم یہ تھا کہ بنو قریظہ کے معرکہ میں اُس نے حضرت خلاد بن سوید پر قلعہ کے اوپر سے ایک چکی پھینک دی تھی جس سے وہ جاں بحق ہو گئے تھے [۲] (باقی آئندہ)

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۲۵۲ [۲] الدرس ص ۱۹۲

گزارش

خریداری برہان یا ندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلے میں خط و کتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر برہان کی چٹ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں۔ تاکہ تعمیلِ ارشاد میں تاخیر نہ ہو، اس وقت بے حد دشواری ہوتی ہے جب ایسے موقع پر آپ صرف نام لکھنے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

عہدِ نبوی کے غزوات و سرایا

اور

اُن کے ماخذ پر ایک نظر

(۱۸)

(سعید احمد اکبر آبادی)

مقتولین کی تعداد اور اس پر بحث مقتولین کی اصل تعداد کیا تھی؟ اس بارہ میں سخت اختلاف ہے، حافظ ابنِ حجر لکھتے ہیں: ابنِ اسحاق کے نزدیک یہ لوگ چھ سو تھے، ابو عمر نے سعد بن معاذ کے ترجمہ میں اس کو ہی صحیح قرار دیا ہے، لیکن قتادہ کی ایک مرسل روایت کی روشنی میں ابن عائذ کے نزدیک یہ سات سو تھے، سہیلی نے کہا ہے کہ تعداد آٹھ سو اور نو سو کے درمیان تھی، اس کے برخلاف جابر کی روایت میں جو ترمذی، نسائی اور ابن حبان کے ہاں صحیح اسناد سے منقول ہے، چار سو فوجیوں کی تعداد بیان کی گئی ہے" اس کے بعد حافظ ابن حجر ان مختلف روایات میں تطبیق اس طرح کرتے ہیں کہ ممکن ہے چار سو اصل فوجی اور جنگجو ہوں اور باقی لوگ ان کے اتباع یعنی پیرو کار ہوں" پھر لکھتے ہیں: "ابنِ اسحاق سے یہ بھی مروی ہے کہ بعض لوگوں نے یہ تعداد نو سو بھی بتائی ہے"[1] علامہ بدر الدین عینی نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ بعینہٖ یہی ہے[2]، اس کا حاصل ہوا۔

---

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۳۱۹ [2] عمدۃ القاری ج ۸ ص ۲۵۷

کہ مقتولین کی تعداد زیادہ سے زیادہ نوسو تھی اور کم سے کم چار سو، مولانا شبلی نے چار سو کی روایت کو ترجیح دی ہے لیکن اس سلسلہ میں چند باتیں غور طلب ہیں

۱۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تعداد میں اس قدر شدید اختلاف کہ ایک طرف چار سو اور دوسری جانب نوسو خود اس بات کا قرینہ ہے کہ کوئی تعداد بھی یقینی نہیں ہے، پھر سوال یہ ہے کہ تعداد جو کچھ بھی رہی ہو اُس کا علم کیوں کر ہوا؟ ظاہر ہے اُس وقت رجسٹر رکھنے کا رواج تو تھا نہیں جس میں ناموں کا اندراج ہو، اس بنا پر اس روایت کا دار و مدار سننے سنانے پر ہی ہو سکتا ہے، ان بیان کرنے والوں میں کچھ ایسے بھی لوگ ہوں گے جنھوں نے یہ منظر اپنی آنکھ سے دیکھا ہوگا تاہم یہ یقینی ہے کہ جہاں تک تعداد کا تعلق ہے ان کا بیان بھی تخمینی ہی ہو سکتا ہے، قطعی اور حتمی نہیں، اور اس قسم کے مواقع پر انسانی فطرت کا خاصہ مبالغہ کرنا ہے، چنانچہ ہماری عربی اور فارسی کی تاریخیں اُٹھا کر دیکھ لیجئے اُن میں جنگ و جدال کے واقعات کے بیان میں کس درجہ مبالغہ پایا جاتا ہے اگر دشمن کی فوج کے سو دو سو آدمی مارے گئے ہیں تو مورخین کے ہاں یہی تعداد ہزار سے کم نہیں رہے گی، البتہ محدثین اس باب میں بھی محتاط ہوتے ہیں، اُن کے ہاں یہ مبالغہ آرائی نہیں پائی جاتی، یہی وجہ ہے کہ جہاں تک صحاح ستہ کا تعلق ہے، جیسا کہ آپ نے ابھی حافظ ابن حجر کے حوالہ سے پڑھا۔ ترمذی اور نسائی کے علاوہ باقی چاروں صحاح تعداد کے معاملہ میں خاموش ہیں حالانکہ چار سو انسانوں کا قتل معمولی بات نہیں سینکڑوں آدمیوں نے اسے دیکھا ہوگا۔ اس کے باوجود اکابر محدثین کا تعداد کے بارہ میں خاموش رہنا خالی از علت نہیں ہو سکتا پھر یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ حضرت عائشہؓ اس واقعہ کی شاہد عدل ہیں چنانچہ عورت کے قتل کی راوی وہی ہیں اور حضرت علی اور حضرت زبیر کا تو اس واقعہ قتل سے براہِ راست تعلق ہی تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی نے مقتولین کی تعداد کا ذکر نہیں کیا ہے۔

(۲) واقعہ کی روایت میں اُس کے بعض اجزا سے متعلق مختلف الفاظ ملتے ہیں اور اُن سے مختلف نتائج برآمد ہوتے ہیں مثلاً ابن اسحاق کی روایت میں حضرت سعد بن معاذ کے الفاظ یہ ہیں:۔

ان تقتل الرجال وتسبی ذراریھم — مردوں کو قتل اور اُن کی عورتوں اور بچوں کو باندی غلام بنا لیا جائے۔

چنانچہ کم و بیش ارباب سیر اور مورخین یہی کہتے ہیں کہ سعد بن معاذ کے اس فیصلہ کے مطابق بنو قریظہ کے سب بالغ مرد قتل کر دیے گئے اور اُن کی عورتوں اور بچوں کو باندی غلام بنا کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

لیکن صحیح بخاری میں حضرت ابو سعید الخدری سے جو روایت ہے[1] اُس میں سعد بن معاذ کے فیصلہ میں "الرجال" کے بجائے "مقاتلھم" کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں بنو قریظہ کے سپاہی اور جنگجو، ان دونوں لفظوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں مدارِ قتل بلوغ ہوتا ہے اور دوسری صورت میں مدارِ قتل بلوغ نہیں، بلکہ جنگجوئی اور محاربہ قرار پاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ صحیح جو بات ہے وہ وہی ہے جو صحیح بخاری سے ثابت ہوتی ہے اور اس کی دو وجہیں ہیں:

(الف) ایک یہ کہ یہ بخاری کی روایت ہے اور حضرت ابو سعید الخدری ایسے مقدس اور جلیل القدر صحابی سے منقول ہے،

(ب) اور دوسری یہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتلِ نفس انتہائی نامرغوب اور ناپسندیدہ فعل تھا اور آپ اس اقدام پر بادل ناخواستہ اُسی وقت راضی ہوتے تھے جب آپ کو یقین ہو جاتا تھا کہ اب اصلاحِ حال کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار رہے ہی نہیں، اس بناء پر آپ کو کوئی ذرا سا بہانہ ملتا تو ایک واجب القتل کو بھی معاف فرما دیتے تھے، حد یہ ہے کہ آپ کے اس طرزِ عمل کے باعث فقہ میں ایک مستقل اصل ہے کہ

الحدود تندرء بالشبھات — حدود شبہ سے ساقط ہو جاتی ہیں

چنانچہ اسی قتل بنی قریظہ کے سلسلہ میں آپ نے ذرا ذرا سی بات پر متعدد اشخاص کی

---

[1] ج ۳ باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب و مخرجہ الی بنی قریظہ

جاں بخشی فرما دی (تفصیل کے لئے دیکھئے الاناد ص ۱۹۳) فتح مکہ کے موقع پر آپ نے جس رحمدلی سے دشمنوں سے عفو و درگذر اور مسامحت و مجاملت کا معاملہ اپنے اور اسلام کے سخت ترین دشمنوں کے ساتھ کیا ہے اسلام کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اُس کی داد دینے پر مجبور ہو گیا ہے، مولانا شبلی نے نہایت بلیغ انداز میں اس منظر کی تصویر کشی کی ہے، آپ بھی سنئے فرماتے ہیں:

"خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیشرو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں وہ بھی تھے جن کے تیغ و سنان نے پیکرِ قدسی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایڑیوں کو لہو لہان کر دیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر اُن کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے،

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا:" تم کو کچھ معلوم ہے! میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے شقی تھے، بے رحم تھے لیکن مزاج شناس تھے، پکار اُٹھے:۔

أَخٌ كَرِيمٌ وَابْنُ أَخٍ كَرِيمٍ — تو شریف بھائی ہے اور شریف برادرزادہ ہے!

ارشاد ہوا:۔

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، اذهبوا انتم الطلقاء — تم پر آج کوئی الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو

(سیرت النبی ج ۱ ص ۵۲۰)

غزوۂ بدر سے زیادہ سخت دن اور کون سا ہو سکتا تھا، لیکن آپ پڑھ آئے ہیں اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر قریش کے چند خاص آدمیوں کے نام لے کر مسلمانوں کو حکم

دیا کہ اگر ان لوگوں پر قابو چلے تو انھیں قتل نہ کرنا، کیوں کہ یہ لوگ قریش کے ساتھ بادل نخواستہ آئے ہیں، علاوہ ازیں کتب حدیث میں کتنے ہی واقعات مذکور ہیں جن میں کسی ایک صحابی یا صحابیوں کی ایک جماعت نے کسی ایک کافر کو خطاءً قتل کر دیا ہے اور جب حضور کو اس کی اطلاع ہوتی ہے تو آپ نے اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا اور مقتولوں کا خون بہا دلوایا ہے پس جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی کا عالم یہ ہے تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ آپ نے یہاں بلا تفریق و امتیاز سب بالغ مردوں کو قتل کر دینے کا حکم دے دیا ہو۔

مذکورہ بالا دو وجہوں کی بنا پر اس میں کوئی کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا کہ تاریخ و سیر کی عام کتابوں نے جو یہ تاثر دیا ہے کہ بنو قریظہ کے تمام بالغ مرد (کل من انبت) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مارے گئے بالکل غلط ہے اور صحیح یہ ہے کہ مقاتلہ (Combatant) قتل کیے گئے، یعنی مدار قتل بلوغ نہیں بلکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف صف آرا اور جنگجو ہونا تھا۔[1]

---

[1] وہ اصولِ درایت جن کی بنیاد پر ایک روایت رد کر دی جاتی ہے اُن میں ایک اصل یہ بھی ہے کہ روایت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور آپ کے طرزِ عمل کے خلاف ہو، چنانچہ بخاری (باب شراء النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالنسیہ) میں حضرت انس کی روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اپنی ایک زرہ ایک یہودی کے پاس گروی رکھ کر اُس سے اپنے متعلقین کے لئے جَو خریدے، اس کے بعد حضرت انس نے کہا: "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کبھی ایک صاع (تقریباً تین سیر) گیہوں یا کوئی اور غلہ بیک وقت نہیں ہوا"، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اور علامہ بدر الدین عینی نے عمدۃ القاری میں اس روایت پر کلام کرتے ہوئے اس کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ یہ روایت ظاہر حقیقت حال اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف ہے، اور حضور تو حضور، کسی صحابی کی بھی اگر کسی روایت سے تنقیص نکلتی ہے تو محدثین نے اُس کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، مثالوں کے لئے دیکھئے ماہنامہ معارف اعظم گڈھ بابت جولائی و اگست ۱۹۵۵ء مقالہ مولانا حبیب الرحمن خاں از مولانا عبد السلام قدوائی، غزوۂ احزاب کے سلسلہ میں حضرت حسان بن ثابت سے متعلق ایک روایت ہے، جس سے اُن پر بزدلی کا الزام آتا ہے، حافظ ابن عبد البر نے اس روایت کو محض اس بنا پر منکر قرار دے دیا ہے کہ اگر یہ الزام درست ہوتا تو جن شاعروں نے حضرت حسان کی ہجو کی ہے وہ اس کا ذکر کرتے۔

(الدرر ص ۱۸۶)

مقاتلہ کی تعداد | آئیے ! اب یہ دیکھیں کہ بنو قریظہ کے مقاتلہ کی تعداد کیا تھی ؟ اور وہ سب مارے گئے ۔ یا سب نہیں بلکہ اُن کی ایک تعداد ماری گئی ۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے بنو قریظہ کے فوجیوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زیادہ بتائی ہے (عہد نبوی کے میدانِ جنگ ص ۵۷) اور یہ بالکل قرین قیاس ہے ، کیوں کہ غزوۂ احزاب میں جتنے مسلمان شریک تھے یعنی تین ہزار پیادہ اور چھتیس ۳۶ سوار آپ اُن سب کو لے کر بنو قریظہ کے لئے روانہ ہوئے تھے ، ظاہر ہے اگر بنو قریظہ کے فوجیوں کی تعداد کم ہوتی تو حضور کو اتنی بڑی جمعیت ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی ، پس اگر واقعی بنو قریظہ کے فوجیوں یعنی مقاتلہ کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زائد تھی اور یقیناً تھی تو حضرت جابر کی روایت کے مطابق چار سو مقاتلہ کے قتل کیے جانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بالغ مرد تو الگ رہے جو فوجی تھے وہ بھی تقریباً ایک چوتھائی مارے گئے ، یہ ہرگز نہیں ہوا کہ اُن سب کا صفایا کر دیا گیا ہو ، پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ حی بن اخطب قریظہ نہیں بنو نضیر سے تھا ۔ اس بنا پر یہ عجب نہیں کہ مقتولین کی فہرست میں اسی طرح کچھ اور قبیلوں کے لوگ ہوں ۔

مغربی مصنفین | جب بالغ مردوں کے قتل عام کی روایت مسلمان مورخین کے ہاں ہی چلی ہوئی ہو تو پھر مغربی مصنفین سے کیا شکایت کی جائے ، البتہ فرق یہ ہے کہ سر ولیم میور اور مارگولیوتھ جیسے کٹر متعصب افراد اس کو وحشت اور بربریت کہتے ہیں اور پروفیسر واٹ منٹگمری ایسے سنجیدہ مستشرقین اس کے جواز میں کہتے ہیں کہ بنو قریظہ نے عہد شکنی کر کے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مسلسل پروپگنڈا اور معاندانہ حرکات کر کے اپنا اعتبار و اعتماد کھو دیا تھا اس بنا پر جو لوگ قتل کئے گئے ان کو نرمی کی توقع نہیں ہو سکتی تھی[1] البتہ ہمارے علم میں مستشرقین میں پروفیسر ہٹی پہلے شخص ہیں جن کے ہاں اُس امر کی طرف اشارہ ملتا ہے جس کو ہم نے ابھی ثابت کیا ہے ، چنانچہ مقتولین قریظہ کی ایک معین تعداد بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں : " باقی لوگوں کو خارج البلد کر دیا گیا۔"[2]

---

[1] محمد ان مدینہ ص ۳۲۸ [2] تاریخ عرب ص ۱۱

بہرحال جب سب فوجی بھی قتل نہیں کئے گئے تو تعداد سے قطع نظر جو لوگ قتل کئے گئے وہ یقیناً وہی ہوں گے جو کعب بن اسد کی طرح قوم کے لیڈر، سرغنہ اور فتنہ کی جڑ ہوں گے، ان کی تعداد کیا تھی؟ ابن ہشام اور الروض الانف میں یہودی قبائل کے اُن تمام سرداروں کے نام درج ہیں جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور اسلام کی بیخ کنی کی کوششوں میں سب کے پیشرو اور اُن کے سرغنہ تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے بنو قریظہ کے ایسے سرداروں کے بھی نام لکھے ہیں، یہ نام شمار میں سترہ ہیں[۵۱] ہم یہ نہیں کہتے کہ بس یہی سترہ آدمی قتل کئے گئے، سوال یہ ہے کہ بنو قینقاع اور بنو نضیر کے قبیلوں کے علاوہ اور دوسرے یہود قبائل میں بھی تو ایسے ہی جنگجو اور فتنہ پرور موجود تھے، جن کے نام تاریخ میں درج ہیں، ابن اسحاق نے ان کی مجموعی تعداد ۶۷ سڑسٹھ لکھی ہے، تو یہ سب کہاں گئے اور ان کا کیا حشر ہوا؟

ایک نکتہ | اصل یہ ہے کہ جب ہم بنو قریظہ، بنو نضیر یا بنو قینقاع بولتے ہیں تو یہ صرف اکثریت کے اعتبار سے بولتے ہیں، مدینہ میں یہی تین قبیلے صاحب اقتدار اور صاحب املاک و جائداد تھے، اُن کے اپنے اپنے قلعے اور علاقے تھے، ان علاقوں میں ان کے بنی اعمام یا بنی اخوال جو دوسرے قبیلوں یا اُن کی شاخوں سے تعلق رکھتے تھے وہ بھی رہتے تھے مگر عام بول چال میں وہ بنو نضیر، بنو قینقاع یا بنو قریظہ ہی کہلاتے تھے[۵۲]، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ بنو قریظہ کے کچھ لوگ اس واقعہ کے دن مسلمان ہو گئے تھے، لیکن حافظ ابن عبد البر نے تصریح کی ہے کہ یہ لوگ نہ قریظی تھے اور نہ نضیری، بلکہ قبیلہ ہدل کی ایک جماعت سے تعلق رکھتے تھے جو بنو قریظہ کے ساتھ اُن کے قلعہ میں مقیم تھے[۵۳]۔ اس بناء پر جب یہ کہا جاتا ہے کہ بنو قریظہ کے اتنے افراد مارے گئے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ سب افراد بنو قریظہ کے ہی تھے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ان میں بنو قریظہ کے ساتھ دوسرے قبیلوں کے بھی افراد تھے جو بنو قریظہ کے قلعوں میں مقیم تھے، علاوہ ازیں

---

[۵۱] ابن ہشام ج ۲ ص ۱۳۷ و مابعد والروض الانف ج ۲ ص ۲۴ [۵۲] تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ العرب قبل الاسلام ڈاکٹر جواد علی ج ۶ الفصل الاول الیہودیۃ بین العرب اور محمدان مدینہ باب چہارم۔

[۵۳] الاستیعاب ص ۱۹۱

یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ حی ابن اخطب قوم کا ایک عظیم سردار تھا اور ایک سردار جب کسی مہم پر روانہ ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ دس پانچ اُس کے معاون و مددگار ضرور ہوتے ہیں اگرچہ نام سردار کا ہی ہوتا ہے اس لئے عجب نہیں کہ اس موقع پر حی ابن اخطب کے ساتھ چند اور نضیری بھی مارے گئے ہوں جن کے نام تاریخ نے محفوظ نہیں رکھے۔

یہودِ مدینہ کے ساتھ یہ اسلام کا آخری معرکہ تھا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے ساتھ ہر قسم کی ملاطفت اور مدارات کے باوجود ان کی روز افزوں ریشہ دوانیوں اور فتنہ انگیزیوں کے باعث ان سے بالکل مایوس اور دل برداشتہ ہو چکے تھے اور آپ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس فتنہ کی جڑ ہی کاٹ دینی ہے اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس موقع پر مقتولین کی تعداد خاصی بڑی رہی ہوگی، تاہم یہ باور کرنا مشکل ہے کہ یہ تعداد چار سو تک پہونچی ہوگی اور اس کے وجوہ یہ ہیں :-

(۱) عہدِ نبوی کے تمام غزوات و سرایا میں دشمن کے جو لوگ قتل ہوتے ہیں ڈاکٹر حمید اللہ نے اُن کی تعداد عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ میں مشکل سے ڈیڑھ سو بتائی ہے (ص ۷) لیکن انھوں نے اپنی انگریزی کتاب "محمد رسول اللہ" میں یہی تعداد "تین سو سے کم" لکھی ہے ڈاکٹر صاحب نے اپنی متعدد محققانہ کتابوں میں بنو قریظہ کے واقعہ کا ذکر کیا ہے، لیکن کہیں ہماری نظر سے یہ نہیں گذرا کہ انھوں نے مقتولین کی تعداد لکھی ہو یا اُس پر بحث کی ہو، اس بناء پر ہمارے خیال مذکورۂ بالا تعداد میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ایک جگہ انھوں نے مقتولین غزوات و سرایا کے ساتھ مقتولینِ قریظہ کو شامل کر لیا ہے اور ایک جگہ نہیں کیا، اور اگر بالفرض تین سو سے کم میں بھی بنو قریظہ شامل نہیں ہیں تو یہ کیسی عجیب و غریب بات ہوگی کہ تمام جنگوں میں جن کے نتیجہ میں دس لاکھ سے زیادہ مربع میل کا رقبہ اسلام کے زیرِ نگین آگیا اور وہ بھی دس برس میں! اُن سب میں تو تین سو سے کم آدمی مارے گئے اور صرف ایک واقعہ جس میں جنگ ہوئی ہی نہیں اُس میں چار سو آدمی ہلاک کر دئے گئے ہوں۔

(۲) چار سو آدمیوں کا قتل معمولی بات نہیں، اگر ایسا ہوتا تو مدینہ میں تلاطم پیدا ہو جاتا اور بچہ بچہ کی زبان پر اُس کا چرچا ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مدینہ کی فضا اس درجہ پرسکون ہے کہ گویا کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہی نہیں اور کم ازکم یہود پر تو اس واقعہ کی دہشت اس درجہ ہوتی کہ مدینہ میں ایک یہودی بھی نظر نہ آتا، حالانکہ یہ ثابت ہے کہ اس واقعہ کے بعد بھی مدینہ میں مختلف قبیلوں کے یہودیوں کی خاصی تعداد آباد رہی ہے اور ان میں ابوالشحم جیسے مال دار اور ارباب ثروت یہودی بھی تھے جو تجارت کرتے تھے

پروفیسر واٹ منٹگری نے تو قریظہ کے واقعہ کے بعد بھی مدینہ میں خوش حالی کے ساتھ یہودیوں کے باقی رہنے سے اُن یورپین مصنفین کے خلاف استدلال کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام کا شروع سے یہ منصوبہ تھا کہ یہود کا مدینہ سے استیصال کر دیا جائے، موصوف اس کی تردید میں لکھتے ہیں کہ یہ کہنا غلط ہے، بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جیسے جیسے حالات پیدا ہوتے گئے پیغمبرِ اسلام عمل کرتے گئے، بنو قریظہ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے کسی طے شدہ پالیسی کا نہیں۔ بلکہ وقتی حالات کا نتیجہ تھا[1]۔

(۳) اربابِ سیر عموماً ہر غزوہ کے مقتولین و شہدا کے نام لکھتے ہیں، پھر مقتولین قریظہ کے نام کہاں ہیں؟

ان وجوہ کی بنا پر چار سو کی تعداد بے حد مشکوک اور مشتبہ ہے اور اسلم طریقہ وہی ہے جو اکابر محدثین اور محتاط مصنفین نے اختیار کیا ہے، یعنی تعداد کا ذکر ہی نہ کیا جائے۔

باقیماندہ بنو قریظہ کہاں گئے اب سوال یہ ہے کہ باقی ماندہ بنو قریظہ کہاں گئے؟ اس سلسلہ میں کوئی قطعی بات تو نہیں کہی جا سکتی، کیوں کہ تاریخ خاموش ہے۔ البتہ قیاسات سے کچھ لیا جا سکتا ہے، پروفیسر ہٹی کا یہ بیان آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ "باقی ماندہ لوگوں کو خارج البلد کر دیا گیا"، ڈاکٹر حمید اللہ نے امام محمد کی کتاب الاصل مخطوطہ استنبول کے حوالہ سے بنو قینقاع

---

[1] محمد ان مدینہ ص ۲۱۷